خدا کی دریافت

سائنس کی روشنی میں خدا پر ایمان



مولانا وحید الدین خاں

خدا کی دریافت

سائنس کی روشنی میں خدا پر ایمان

مولانا وحید الدین خاں

Khuda ki Daryaft (Urdu)
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 2020

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 9111-4182-7083, 4652-1511
Fax: 9111-4565-1771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com
www.goodword.net

Islamic Vision Ltd.
434 Coventry Road, Small Heath
Birmingham B10 0UG, U.K.
Tel. 121-773-0137, Fax: 121-766-8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk
www.islamicvision.co.uk

Al-Risala Forum International
2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA
Tel. 215-240-4298, Cell: 617-960-7156
email: cps@alrisala.org, www.alrisala.org

فہرست

خدا انسانی فطرت کی آواز

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

دیباچہ

خدا کی دریافت کا سفر ایک فطری سفر ہے۔ وہ اتنا آسان ہے کہ ہر آدمی عین اپنے پاس سے اس کو شروع کرسکتا ہے۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عرب بدو سے سوال کیا گیا:

مَا الدَّلِيلُ عَلَى وُجُودِ الرَّبِّ تَعَالَى؟ فَقَالَ: يَا سُبْحَانَ اللَّهِ إِنَّ البعر ليدل عَلَى الْبَعِيرِ، وَإِنَّ أَثَرَ الْأَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَى الْمَسِيرِ، فَسَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ، وَأَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ، وَبِحَارٌ ذَاتُ أَمْوَاجٍ أَلَا يَدُلُّ ذَلِكَ عَلَى وُجُودِ اللَّطِيفِ الْخَبِيرِ؟ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 106)۔ یعنی رب العالمین کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: سبحان اللہ، مینگنی اونٹنی پر دلالت کرتی ہے، قدم کے نشان چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں، تو برجوں والا آسمان، اور کشادہ راستوں والی زمین، اور موجوں والے سمندر، کیا اس ذات پر دلالت نہیں کریں گے، جو بڑا باریک بیں اور بڑا باخبر ہے؟

یہ واقعہ ایک عام انسان کا واقعہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالق کی پہچان کا معاملہ اتنا زیادہ آسان ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے طور پر وہ اپنی قریب ترین مثال سے سمجھ سکتا ہے۔ خالق کی دریافت کے لیے کسی لائبریری میں جانے کی یا کسی دور کا سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔ شرط یہ ہے کہ آدمی متلاشی (seeker) ہو۔

مثلاً ایک آدمی نے سوال کیا کہ ہم خدا کو کیسے پہچانیں۔ میں نے کہا آپ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کو دیکھیے۔ اگر ایسا ہوتا کہ ہاتھ کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی ہوتی، اور پاؤں کی انگلیاں بڑی بڑی ہوتی تو زندگی کتنی مشکل ہوجاتی۔ اتنی گہری پلاننگ صرف خَلّاق اور رزّاق ہی کرسکتا ہے۔ اگر آپ ایک ایسے خدا کو نہ مانیں، جو خَلّاق اور رزّاق ہے، تو آپ ہر معلوم چیز کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ خدا کو پہچاننا اتنا ہی آسان ہے، جتنا کہ خود اپنے آپ کو پہچاننا۔

اس قسم کی دریافت کو کامن سنس کی سطح پر خالق کی دریافت کہا جاتا ہے۔ لیکن دریافت کی ایک

اور سطح ہے، جو جدید دور میں انسان نے ڈسکور کی ہے، اور وہ ہے سائنسی دلائل کے ذریعے خالق کی دریافت۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے (فصلت، 41:53)۔ آج انسان ان دلائل کے ذریعے آسانی کے ساتھ خدا کو دریافت کرسکتا ہے۔

*****

سائنس فطرت (nature) کے مطالعے کا نام ہے۔ فطرت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں، جن کو ہم کائنات کہتے ہیں۔ سائنسی مطالعے کا آغاز کچھ ابتدائی باتوں سے ہوا، لیکن یہ مطالعہ جتنا زیادہ بڑھتا گیا، اتنا ہی یہ ظاہر ہوتا گیا کہ کائنات (universe) ایک بے حد بامعنی کائنات ہے۔ کائنات کی کوئی بھی ایسی تشریح جو کائنات کی معنویت کے اعتراف پر قائم نہ ہو، وہ سائنسی تحقیقات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مثلاً سائنسی مطالعے کے ذریعے معلوم ہوا کہ کائنات کے اندر ایک ذہین ڈیزائن (intelligent design) ہے۔ اب اگر یہ نہ مانا جائے کہ کائنات کا ایک ذہین ڈیزائنر (intelligent designer) ہے تو کائنات کا نادر ظاہرہ ناقابلِ توجیہہ بن جاتا ہے۔

اِسی طرح سائنس کے مطالعے نے بتایا کہ ہماری کائنات ایک کسٹم میڈ (custom-made) کائنات ہے، یعنی وہ انسان کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ اب اگر ایک ایسے خالق کو نہ مانا جائے جس نے دو الگ الگ چیزوں کے درمیان اِس مطابقت کو قائم کیا، تو اِس ظاہرے کی کوئی قابلِ فہم توجیہہ ممکن نہیں۔ اِسی طرح مختلف شعبوں میں سائنس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات کے مختلف اجزاء آپس میں بے حد مربوط ہیں، اور ان کے درمیان ایک انتہائی فائن ٹیوننگ (fine-tuning) پائی جاتی ہے تو اِس مائنڈ باگلنگ (mind-boggling) ظاہرے کی ضرور کوئی توجیہہ ہونی چاہیے۔

سائنس کوئی مذہبی سبجیکٹ نہیں، سائنس کا موضوع خالق کی دریافت نہیں۔ سائنس کا موضوع تخلیق (creation) کی دریافت ہے، لیکن خالق (Creator) تخلیق سے جدا نہ تھا، اِس لیے تخلیق کا مطالعہ عملاً خالق کا مطالعہ بن گیا۔ سائنس نے اپنے مطالعے کے ذریعے جو چیزیں دریافت کیں، وہ سب خدائی

نشانیوں کا اظہار بن گئیں جن کو قرآن میں 'آیات اللہ' (signs of God) کہا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ تخلیق کی معنویت کی دریافت خالق کی معنویت کی دریافت کے ہم معنی ہے۔

خدا کی معرفت اول دن سے راقم الحروف کی تلاش کا مرکز رہا ہے۔ میرا دن اور میری راتیں اسی تلاش میں گزری ہیں، یہاں تک کہ شاید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کو پالیا ہے۔ 1960 کے آس پاس کی بات ہے۔ میں اپنے بڑے بھائی کے گھر 9 بدرقہ روڈ اعظم گڑھ میں تھا۔ وہاں میری ملاقات شاہ نصیر احمد صاحب سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران اچانک انھوں نے کہا: کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ میری زبان سے نکلا: کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا۔ اس طرح کے تجربات میری زندگی میں بہت زیادہ ہیں۔ تاہم اس دنیا میں خدا کو دیکھنا مجازی معنی میں ہے، نہ کہ حقیقی معنی میں۔ کیوں کہ حقیقی معنی میں اللہ رب العالمین کو دیکھنا، اس دنیا میں کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

*****

میں نے ایک مرتبہ کسی مضمون میں لکھا تھا— خدا کو ماننا عجیب ہے، لیکن خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ جب میں خدا کو مانتا ہوں تو میں زیادہ عجیب کے مقابلے میں کم عجیب کو ترجیح دیتا ہوں:

> To believe in God is strange, but not believing in God is stranger still. When I say that I believe in God I prefer the less strange to the more strange.

البرٹ آئن سٹائن کے ایک جرمن دوست نے اس سے پوچھا کیا آپ اتھیسٹ (atheist) ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ تم مجھ کو زیادہ صحیح طور پر اگناسٹک (agnostic) کہہ سکتے ہو۔ اگناسٹک کا مطلب متشکک ہے۔ یعنی کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ خدا نہیں ہے، اور نہ یہ کہہ سکتا کہ خدا ہے۔

اس جملہ کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ خدا کے انکار کے حق میں میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ البتہ سائنٹفک دلائل (scientific evidence) اس معاملہ میں اتنے زیادہ ہیں کہ میں

یہ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ خدا نہیں ہے۔ آئن اسٹائن کا یہ جملہ ففٹی ففٹی کا جملہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے:

I can say that probably there is a God but I cannot say in certain terms, 'Yes there is certainly a God'.

کوانٹم فزکس کی اصطلاح میں میں کہوں گا کہ آئن اسٹائن کا یہ کہنا خدا کے اقرار کے ہم معنی ہے۔کیوں کہ سب ایٹمک پارٹیکل (subatomic particle) اور پرابیبلٹی ویوز (probability waves) کی دریافت کے بعد کوانٹم فزکس (quantum physics) میں پرابیبلٹی (probability) کو یقین کے قریب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے:

Probability is less than certainty but it is more than perhaps.

*****

حق کی تلاش ایک فطری تلاش ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو وہ سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کیا ہے، وہ کیسے وجود میں آیا، دنیا میں اس کی معنویت کیا ہے۔ اسی کا نام حق کی تلاش ہے۔ یہ ہمیشہ تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی مشترک تلاش رہی ہے۔ شاید کوئی بھی انسان اس اسپرٹ سے خالی نہیں۔ کسی نے اس تلاش کو فلسفیانہ تلاش کا درجہ دیا، کوئی اس کو صوفیانہ تلاش سمجھا، کسی نے اس کو مراقبہ (meditation) کے ذریعے دریافت کرنا چاہا، کسی نے یہ سمجھا کہ روحانی ریاضت کے ذریعے وہ اس کو پا سکتا ہے، کسی نے کسی اور طریقے سے اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کی۔

جہاں تک راقم الحروف کا اندازہ ہے، اٹلی کے سائنسداں گلیلیو (1564-1642ء) کے زمانے سے اس تلاش نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ اب یہ ہوا کہ اس تلاش کا کمیاتی پہلو (quantitative aspect)، اور اس کا کیفیاتی پہلو (qualitative aspect) ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا۔ یہی دور اب تک جاری ہے۔

خوردبین اور دوربین کی دریافت نے اس تلاش میں ایک نئے دور کا اضافہ کیا ہے۔ اب انسان نے یہ جانا کہ اس سوال کا کیفیاتی پہلو (qualitative aspect) عملاً قابلِ دریافت نہیں

ہے، لیکن اس کا کمیاتی پہلو (quantitative aspect) بڑی حد تک قابلِ دریافت ہے۔ اب یہ ہوا کہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ کیفیاتی پہلو کچھ مخصوص لوگوں کی دریافت کے موضوع کی حیثیت سے باقی رہا۔ لیکن جہاں تک کمیاتی پہلو کا سوال ہے، سائنس دانوں کی پوری جماعت اس کی دریافت میں مشغول ہو گئی۔ اسی کو آج ہم سائنس کہتے ہیں۔

پھر اس قابلِ مشاہدہ پہلو کے دو حصے ہو گئے۔ ایک وہ جس کو نظری سائنس کہا جاتا ہے، اور دوسرا وہ جس کو تطبیقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں، اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے کثیر تعداد میں مضامین لکھے ہیں۔ اگلے صفحات پر اس قسم کی کچھ مذہبی صداقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وحیدالدین　　　25 مئی 2020

نئی دہلی

خدا کی دریافت

خدا کی دریافت

Discovery of God

خدا کی فلسفیانہ تلاش (philosophical pursuit of God) کی تاریخ قدیم یونان کے دور تک جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ پہلا یونانی فلاسفر تھیلز آف میلٹس (Thales of Miletus) تھا، جس کا زمانہ 624-546 قبل مسیح ہے۔ فلسفہ (philosophy) اپنی حقیقت کے اعتبار سے خالق کی تلاش کا نام ہے۔ لیکن فلسفہ کبھی خالق کی دریافت میں کامیاب نہ ہوسکا۔ فلسفہ کا موضوع وجود ہے:

> Philosophy is the study of general and fundamental questions about existence, knowledge, values, reason, mind, and language.

یہ فلسفہ کے مضمون کا ظاہری بیان ہے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے فلسفہ حقیقت اعلیٰ (supreme truth) یعنی خدا کی علمی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ تمام فلسفی کسی نہ کسی عنوان کے تحت حقیقت اعلیٰ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ لیکن کوئی فلسفی اپنی تلاش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

فلسفیانہ تلاش کی ناکامی

تمام فلسفیوں کا کیس ایک تھا، وہ ہے حقیقت کی تلاش۔ تمام فلسفیوں نے یہ چاہا کہ وہ سچائی کو علم کے راستے سے جانیں، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہر فلسفی اپنی اس تلاش میں ناکام رہا۔ برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل کا معاملہ بھی یہی تھا۔ برطانی فلسفی برٹرینڈ رسل (1872-1970) کے بارے میں اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ برٹرینڈ رسل ایک ایسا فلسفی تھا، جو اپنا کوئی فلسفہ ڈیولپ نہ کرسکا:

Bertrand Russell was a philosopher of no philosophy

تمام عمر مطالعہ کرنے کے باوجود برٹرینڈ رسل سچائی کو دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ دوسرے فلسفیوں کا کیس بھی یہی ہے۔ مگر دوسرے فلسفیوں نے اس حقیقت کا بہت کم اعتراف کیا،

جب کہ برٹرینڈ رسل نے کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ رسل کا یہ اعتراف اس کی خود نوشت سوانح عمری میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس نے لکھا ہے: ’’جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی ضائع ہوگئی۔ میں ایسی باتوں کو جاننے کی کوشش کرتا رہا، جن کو جاننا ممکن ہی نہ تھا۔ میری سرگرمیاں بطورِ عادت جاری رہیں۔ میں بھلاوے میں پڑا رہا۔ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میں اس کو چھپا نہیں پاتا کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں، اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ نیا مقصدِ حیات کیا ہے، جس میں میں اپنی بقیہ عمر کو وقف کروں۔ میں اپنے آپ کو کامل تنہائی میں محسوس کرتا ہوں، جذباتی اعتبار سے بھی اور مابعد الطبیعیاتی اعتبار سے بھی، جس سے میں کوئی مخرج نہیں پاتا‘‘:

"When I survey my life, it seems to me to be a useless one, devoted to impossible ideals. My activities continue from force of habit, and in the company of others, I forget the despair which underlies my daily pursuits and pleasure. But when I am alone and idle, I cannot conceal for myself that my life has no purpose, and that I know of no new purpose to which to devote my remaining years. I find myself involved in a vast mist of solitude both emotional and metaphysical, from which I can find no issue."

(*The Autobiography of Bertrand Russell,* 1950, p. 395)

مگر یہ بات صرف ایک فلسفی کی بات نہیں۔ بلکہ تمام فلسفیوں کا معاملہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے۔ حقیقتِ اعلیٰ (supreme reality) ہر فلسفی کی تلاش کا موضوع رہا ہے، لیکن کوئی فلسفی اپنی تلاش کا جواب نہ پاسکا۔

صحیح طریقِ کار

اس ناکامی کا راز یہ ہے کہ فلسفیوں کو اپنی تلاش کے لیے صحیح میتھڈالوجی کی دریافت نہ ہوسکی۔ قرآن میں صحیح طریقِ کار (methodology) کی نشاندہی کی گئی تھی۔ لیکن اس میتھڈالوجی کو انسان

صرف اس وقت دریافت کرسکا، جب کہ اٹلی کے سائنس داں گلیلیو گلیلی (1564-1642) نے دوربین (telescope) کو فلکیاتی مطالعے کے لیے استعمال کیا۔ گلیلیو گلیلی کو ماڈرن سائنس کا موجد (father of modern science) سمجھا جاتا ہے۔ جدید سائنس کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان نے 1608ء میں ابتدائی طور پر دوربین ایجاد کی۔ گلیلیو نے 1609ء میں دوربین کو مزید ڈیولپ کیا، اور پہلی بار دوربین کے ذریعے شمسی نظام (solar system) کا مطالعہ کیا۔

اس معاملے کا آغاز حقیقۃً ساڑھے تین ہزار سال پہلے پیغمبر موسی کے تجربے سے ہوا۔ یہ قصہ قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلَكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (7:143)۔ یعنی اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آ گیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا، مجھے اپنے کو دکھا دے کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ فرمایا، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہے تو تم مجھ کو دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلّی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش آیا تو بولا، تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ لَنْ تَرَانِي (تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے)۔ آیت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں)۔ ان دونوں الفاظ کے فرق پر پر غور کیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان براہ راست اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ وہ بالواسطہ طور پر اللہ کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

گلیلیو گلیلی

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس بالواسطہ طریقِ کار کا آغاز گلیلیو کے زمانے میں ہوا، جب کہ

گلیلیو نے دوربین کا استعمال کیا۔ یعنی دوربین کے ذریعے پہلی بار وہ سائنسی طریقِ کار شروع ہوا، جو حقیقت اعلیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے۔

چنانچہ کوانٹم فزکس (quantum physics) کے زمانے میں یہ ثابت ہوا کہ مادہ (matter) کا آخری جزء سب اٹمک پارٹکل (subatomic particle) ہے، اور سب اٹمک پارٹکل براہ راست طور پر قابل مشاہدہ نہیں۔ یہ سب اٹمک پارٹکل مسلسل طور پر حرکت کی حالت میں رہتا ہے۔ اس حرکت کے دوران اس سے ہیٹ جنریٹ (heat generate) ہوتا ہے۔ یہ ہیٹ (heat) بالواسطہ طور پر قابلِ دریافت ہے۔ اس طرح مادہ کا آخری جزء قابلِ دریافت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ خالق کائنات کا ہے۔ خالق کائنات بلا شبہ اپنا حقیقی وجود رکھتا ہے۔ لیکن انسان کی نسبت سے وہ صرف بالواسطہ طور پر قابلِ دریافت ہے۔

اصل یہ ہے کہ فلاسفہ خدا کی تلاش میں تو سرگرداں رہے، لیکن وہ کبھی یقین کے درجے میں خدا کی دریافت تک نہ پہنچ سکے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا طریقہ غیر عملی تھا۔ فلسفیانہ طریقے پر خدا تک پہنچنے والے تمام اہلِ علم خدا کی تلاش کے لیے صحیح میتھڈ (right method) دریافت نہ کرسکے۔ یہ تمام لوگ خدا کو براہِ راست دیکھنا چاہتے تھے، حالاں کہ خدا کی معرفت صرف بالواسطہ انداز میں ممکن تھی۔

ہر ایک نے یہ چاہا کہ وہ خدا کو براہ راست طور پر دریافت کریں، جیسے وہ عالم خلق کی دوسری چیزوں کو دریافت کرتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ خالق (خدا) کے معاملے میں قابلِ عمل نہ تھا۔ اس لیے وہ کامیاب بھی نہیں ہوا۔ سیکولر فلاسفہ اور مذہبی متکلمین دونوں کا کیس اس معاملے میں ایک ہی ہے۔

اس معاملے کا صحیح طریقِ کار کیا ہے۔ اس کی رہنمائی تاریخ میں پہلی بار اسرائیلی پیغمبر حضرت موسی کے قصے میں ملتی ہے۔ پیغمبر موسی ساڑھے تین ہزار سال پہلے قدیم مصر میں پیدا ہوئے۔ ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ قرآن میں آیا ہے۔ ان کے ساتھ یہ واقعہ کوہِ طور پر پیش آیا، جو صحرائے سینا میں 2285 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس واقعے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے وجود کا علم انسان کو صرف بالواسطہ طور پر حاصل ہوتا ہے، یعنی تخلیق

(creation) پرغور کرکے خالق (Creator) کے علم تک پہنچنا۔ پیغمبر موسی کے تجربے کی صورت میں یہ رہنمائی تاریخ میں ساڑھے تین ہزار سال سے موجود تھی، لیکن اہلِ علم کبھی اس طریقِ کار (methodology) کو اختیار نہ کرسکے۔ وہ بدستور اس کوشش میں لگے رہے کہ وہ خالق کو براہ راست دریافت کرسکیں۔

حدیث کی مشہور کتاب صحیح البخاری میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3062)۔ یعنی بیشک اللہ ضرور ہی اس دین کی تائید فاجر آدمی کے ذریعے کرے گا۔ اس حدیث میں الرجل الفاجر سے مراد سیکولر انسان ہے۔ اس طرح حدیث میں مستند طور پر یہ سراغ (clue) موجود تھا کہ اس معاملے میں ایک سیکولر انسان ہوگا جو ابتدائی رہنمائی فراہم کرے گا۔ لیکن فلاسفہ اور مسلم متکلمین دونوں اس معاملے میں صحیح رہنمائی تک نہ پہنچ سکے۔

راقم الحروف لمبی مدت تک اس موضوع پر غور کرتا رہا ہے، اور آخر کار اس دریافت تک پہنچا کہ صحیح البخاری میں جس الرجل الفاجر (سیکولر انسان) کا ذکر ہے، غالباً ان میں ایک اٹلی کا سائنسداں گلیلیو گلیلی (Galileo Galilei) ہے، جو چار سو سال پہلے پیدا ہوا۔ اس معاملے میں گلیلیو کا رول چونکہ براہ راست نہیں تھا، بلکہ بالواسطہ تھا۔ یعنی اس کی دریافت سے بالواسطہ طور پر اس سوال کا جواب مل رہا تھا کہ خدا کی معرفت تک پہنچنے کا طریقِ کار (method) کیا ہے۔

گلیلیو گلیلی کے زمانے میں ایک واقعہ ہوا، جس کو نیوٹن کے ایپل شاک (apple shock) کی طرح ٹیلی شاک (tele-shock) کہا جاسکتا ہے، یعنی دوربین کی دریافت۔ آئن سٹائن نے لکھا ہے کہ گلیلیو جدید سائنس کا بانی تھا:

Galileo was the "father of modern science."

یہ ایک حقیقت ہے کہ گلیلیو سے سائنس میں نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ لیکن اس دور کے آغاز کا اصل سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں دوربین (telescope) کو 1608 میں ابتدائی طور پر ہالینڈ میں

ایجاد کرلیا گیا تھا۔ اس کے بعد 1609 میں گلیلیو نے اس دوربین کا ترقی یافتہ ورژن (developed version) خود سے تیار کیا، اور پہلی بار دوربین کو استعمال کرکے شمسی نظام (solar system) کا جزئی مشاہدہ کیا۔ اس مطالعے کے ذریعے گلیلیو نے پہلی بار یہ دریافت کیا کہ ارسطو کا قدیم نظریہ غلط تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

اس نظریے کو علم کی زبان میں ہیلیو سینٹرک تھیَری (heliocentric theory) کہا جاتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے دنیا میں جیو سینٹرک تھیَری (geocentric theory) کا رواج تھا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح نیوٹن کی کشش ثقل کا نظریہ ایپل شاک کے واقعے کے بعد دریافت ہوا، اسی طرح گلیلیو کی دریافت کا آغاز ''ٹیلی شاک'' کے بعد پیش آیا۔ یہی واقعہ جدید سائنس (modern science) کے آغاز کا سبب بنا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوربین کی ایجاد سے نئے سائنسی دور کا آغاز ہوا، اور اس امکان کو پہلی بار جس نے استعمال کیا، وہ اٹلی کا سائنس داں گلیلیو گلیلی تھا۔

الکسس کیرل کا تبصرہ

گلیلیو کو جدید سائنس کا بانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ گلیلیو نے ایک چیز کو دوسری چیز سے ڈی لنک (delink) کردیا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر الکسس کیرل (1873-1944) لکھتے ہیں — گلیلیو نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد اور وزن پر مشتمل ہیں، اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جاسکتی ہے، ان ثانوی صفات سے الگ کردیا، جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، اور جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی۔ کمیت کو کیفیت سے جدا کردیا:

Galileo, as is well known, distinguished the primary qualities of things, dimensions and weight, which are easily measurable, from their secondary qualities, form, colour, odour, which cannot be measured. The quantitative was separated from the qualitative. The quantitative, expressed in mathematical language, brought science to humanity. The qualitative was neglected. (Man, the Unknown, New York,

1939, p. 278)

کیفیاتی پہلو(qualitative aspect) کو کمیاتی پہلو(quantitative aspect) سے الگ کرنے کے معاملے کو الکسس کیرل نے بظاہر ایک منفی واقعے کے طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہی وہ واقعہ ہے، جو سائنس میں نئے انقلاب کا سبب بنا۔ اس علاحدگی(delinking) نے سائنسی تحقیق کے بند دروازے کو کھول دیا، جو فلسفہ کے زیرِ اثر سائنس پر بند پڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہر سائنسی شعبہ، فزکس(physics)، فلکیات(astronomy)، کیمسٹری (chemistry)، وغیرہ ، میں تحقیقات ہونے لگیں۔ ان تحقیقات کا براہِ راست تعلق مذہب سے نہ تھا، مگر بالواسطہ طور پر وہ پوری طرح مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ سائنس کے شعبوں میں آزادانہ طور پر تحقیق ہونے لگی۔ اس طرح جو سائنسی دریافتیں ہوئیں، وہ بالواسطہ طور پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے والی تھیں۔

عملی طور پر گلیلیو گلیلی کے اس طریقِ کار کا مطلب تھا— اشیا کے قابل مشاہدہ جزء (observable aspect) کو اشیا کے ناقابل مشاہدہ جزء(unobservable aspect) سے الگ کردینا۔ اس سے پہلے اہلِ علم دونوں کو ایک دوسرے سے ڈی لنک (delink) نہیں کر سکے تھے۔ وہ ناقابل مشاہدہ پہلو کی دریافت میں مشغول ہونے کی بنا پر قابلِ مشاہدہ پہلو کی دریافت سے محروم بنے ہوئے تھے۔ اب یہ ہوا کہ سارا فوکس چیزوں کے قابلِ مشاہدہ پہلو پر آ گیا۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ قابلِ مشاہدہ پہلو کو دریافت کر کے ناقابلِ مشاہدہ پہلو تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ علمی طور پر یہ ممکن ہو گیا کہ قابل مشاہدہ مخلوق کو دریافت کر کے ناقابل مشاہدہ خالق کی بالواسطہ معرفت حاصل کی جا سکے، یعنی وہ طریقہ جس کو استنباطی طریقہ(inferential method) کہا جاتا ہے۔

سائنسی تحقیق میں اس طریقِ کار کے استعمال کے نتیجے میں بالواسطہ انداز میں خدائی حقیقتیں قابلِ دریافت ہو گئیں۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اس موضوع پر بڑی تعداد میں مقالات اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں اس قسم کی صرف ایک کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے:

The Evidence of God in an Expanding Universe: Forty American Scientists Declare Their Affirmative Views on Religion (John Clover Monsma, G. P. Putnam's Sons, 1958, pp. 250)

اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کا عربی ٹائٹل یہ ہے:

الله يتجلى فی عصر العلم

مترجم: الدمرداش عبدالمجید سرحان، مؤسسۃ الحلبی وشرکاہ للنشر والتوزیع، 1968۔

راقم الحروف اپنے بارے میں شاید یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس کام کو اپنا اصل موضوع بنایا۔ وسیع مطالعے کے بعد میں نے اس موضوع پر بہت سے مقالے اور کتابیں شائع کیں۔ ان میں سے ایک بڑی کتاب وہ ہے جو اردو زبان میں مذہب اور جدید چیلنج کے نام سے 1966 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے کیا۔ عربی ٹائٹل کا نام ہے: الاسلام یتحدی۔ یہ عربی ورژن پہلی بار قاہرہ سے 1976 میں چھپا، اور یہ 196 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد اس کے بہت سے ایڈیشن بار بار شائع ہوتے رہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ، گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام پہلی بار 1987 میں دہلی سے شائع ہوا۔

کیفیاتی پہلو (qualitative aspect) کو کمیاتی پہلو (quantitative aspect) پہلوؤں کی تفریق (delinking) کے بعد جو سائنسی معلومات سامنے آئیں، ان کو استعمال کر کے مذہب کی صداقت ازسرِ نو ثابت شدہ بن گئی۔

ایمان بالغیب

قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (2:3)۔ یعنی ہدایت یاب لوگ وہ ہیں، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب پر ایمان کا معاملہ سادہ طور پر صرف عقیدے کا معاملہ نہیں ہے، وہ براہِ راست طور پر ہدایت کے معاملے سے جڑا ہوا ہے۔ جس آدمی کے اندر ایمان بالغیب کی صفت ہو، اُسی کو ہدایت ملے گی۔ جو آدمی ایمان بالغیب کی صفت سے محروم ہو، اس کو کبھی ہدایت ملنے والی نہیں۔ جب تمام حقیقتیں غیب میں ہوں تو اعلیٰ حقیقت کی دریافت کا معاملہ اس سلسلے میں استثنا (exception) نہیں ہوسکتا۔

غیب کا لفظ عربی زبان میں صرف غیر موجود کے معنی میں نہیں ہے۔ غیب کا لفظ ایسی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو اگر چہ غیر مشہود (invisible) ہو، مگر وہ غیر موجود (non-existent) نہ ہو، یعنی جب ایک چیز موجود ہوتے ہوئے دکھائی نہ دے تو اس کے لیے غیب کا لفظ بولا جائے گا۔ اللہ کا معاملہ یہی ہے۔ اللہ اگر چہ بظاہر غیب میں ہے، مگر بہ اعتبارِ حقیقت، وہ تمام موجود چیزوں سے زیادہ موجود ہے۔ اِس آیت میں ایمان بالغیب سے اصلاً ایمان باللہ مراد ہے، مگر تبعاً اِس میں وہ تمام متعلقاتِ ایمان شامل ہیں، جن پر ایک مومن کے لیے ایمان لانا ضروری ہے۔ مثلاً وحی، ملائکہ، جنت اور جہنم، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ ہم چیزوں کو دو طریقوں سے جانتے ہیں — ایک، مشاہدہ (observation)، اور دوسرا استنباط (inference)۔ سائنسی اعتبار سے، یہ دونوں طریقے یکساں طور پر معتبر ہیں۔ اعتباریت (validity) کے لحاظ سے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

موجودہ زمانے میں سائنس کو علمی مطالعے کا ایک معتبر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ سائنس کے دو حصے ہیں — ایک ہے، نظری سائنس (theoretical science)، اور دوسرا ہے، فنی سائنس (technical science)۔ سائنسی مطالعے کے مطابق، فنی سائنس کا دائرہ بہت محدود ہے۔ فنی سائنس کے ذریعے چیزوں کے صرف ظواہر (appearance) کو دیکھا جاسکتا ہے، لیکن تمام چیزیں

جو بظاہر دکھائی دیتی ہیں، وہ اپنے آخری تجزیے میں غیر مرئی (invisible) ہوجاتی ہیں۔ مثلاً آپ پھول کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن پھول کی خوشبو کو آپ نہیں دیکھ سکتے۔ پھول کی خوشبو کو کسی بھی خورد بین (microscope) یا دور بین (telescope) کے ذریعے دیکھنا ممکن نہیں۔ حالاں کہ جس طرح پھول کا وجود ہے، اِسی طرح پھول کی خوشبو کا بھی وجود ہے۔

سائنسی مطالعے کے مطابق، تمام چیزیں آخر کار ایٹم کا مجموعہ ہیں، اور ایٹم اپنے آخری تجزیے میں الیکٹران (electron) کا مجموعہ ہے۔ ایک سائنس داں، الفریڈ کورزبسکی (Alfred Korzybski [1879-1950]) نے اِس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پوری کائنات ناقابلِ مشاہدہ الیکٹران کا مجنونانہ رقص (mad dance of electrons) ہے۔ ایک اور سائنس داں نے کائنات کی اِسی غیر مرئی حیثیت کی بنا پر کائنات کو امکان کی لہروں (waves of probability) سے تعبیر کیا ہے۔

اِس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ صرف بظاہر غیر مشہود خالق (Creator) ہی غیب میں نہیں ہے، بلکہ بظاہر مشہود تخلیق (creature) بھی حالتِ غیب میں ہے۔ برٹش سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن (وفات 1944) نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب کا نام یہ ہے:

Science and the Unseen World by A. S. Eddington, Macmillan, 1929, pages 91

حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں ہم جن چیزوں کو دیکھتے ہیں، ہم اُن کے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، چیزوں کی اصل حقیقت ہمارے لیے پھر بھی غیر مشہود (unseen) رہتی ہے۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا اپنی ذات کے اعتبار سے، بظاہر غیر مشہود ہے، لیکن اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا ہمارے لیے مشہود بن جاتا ہے۔ تخلیق کا موجود ہونا اپنے آپ میں خالق کے موجود ہونے کا ثبوت ہے۔ کائنات اتنی زیادہ بامعنی (meaningful) ہے کہ خالق کو مانے بغیر اس کی توجیہہ سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اللہ رب العالمین کا حالتِ غیب میں ہونا ایک اعتبار سے امتحان (test) کی مصلحت کی بنا پر

ہے۔ اللہ اگر آنکھوں سے دکھائی دے تو امتحان کی مصلحت ختم ہو جائے گی۔ اللہ غیب میں ہے، اِسی لیے اُس پر ایمان ہمارے لیے ایک امتحانی پرچہ (test paper) ہے۔ اللہ اگر آنکھوں کے سامنے ہوتا تو اس پر ایمان لانا انسان کے لیے اس کے امتحان کا پرچہ نہ بنتا۔ اللہ کا اور اس سے متعلق ایمانیات کا غیب میں ہونا انسان کے لیے ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اسی کی وجہ سے انسان کے ذہن میں غور وفکر کا عمل (process of thinking) جاری ہوتا ہے۔ اِسی کی بنا پر ایسا ہے کہ ہمارے لیے تدبر کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا میدان موجود ہے۔ اِسی بنا پر ایسا ممکن ہوتا ہے کہ ہم اللہ کو دریافت (discovery) کے درجے میں پائیں۔ اِسی بنا پر یہ ممکن ہے کہ خدا کی معرفت ہمارے لیے ایک خود دریافت کردہ حقیقت (self-discovered reality) ہو، اور بلا شبہ یہ ایک واقعہ ہے کہ خود دریافت کردہ حقیقت سے زیادہ بڑی کوئی اور چیز اِس دنیا میں نہیں۔ اللہ کا اور اُس سے متعلق ایمانیات کا انسان کے لیے غیب میں ہونا، انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ایک لامتناہی ذریعہ (endless source) کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہدایت کے لیے ایمان بالغیب کی شرط کوئی تحکّمی (arbitrary) شرط نہیں ہے، بلکہ وہ انسان جیسی مخلوق کے لیے ایک نہایت معقول شرط ہے۔ کسی بھی بڑی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ بیدار شعور (awakened mind) درکار ہوتا ہے۔ جس انسان کا شعور بیدار ہو، وہی اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑی حقیقت کو سمجھ سکے۔ خدا بلا شبہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اِس لیے خدا پر ایمان یا خدا کی معرفت حقیقی طور پر صرف اُس انسان کو حاصل ہوگی، جو مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعے اپنے شعور کو بیدار کر چکا ہو۔ جس انسان کا شعور بیدار نہ ہو، وہ گویا ذہنی اندھے پن (intellectual blindness) میں مبتلا ہے، اور بلا شبہ ذہنی اندھے پن کے ساتھ خداوند عالم کی معرفت کسی انسان کو نہیں مل سکتی۔

کائنات کی توجیہہ

طبیعیات کے جدید مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے خلا میں ایک کاسمک بال تھا، اس کاسمک بال میں دھماکہ ہوا جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات کا آغاز تھا۔ مطالعہ مزید بتاتا ہے کہ دھماکے کے بعد ایک سیکنڈ کے اندر ایک اور واقعہ ہوا جس نے ذروں کو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ خلا کی وسعت میں پھیلا دیا۔ اس کے بعد تدریجی طور پر موجودہ کائنات بنی۔

ایٹمی ذرات کے رفتار میں تبدیلی ایک بے حد انوکھا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اپنے آپ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک انٹرویز (intervener) کو بتاتا ہے۔ اتفاق (accident) جیسے الفاظ اس کی توجیہہ نہیں کرسکتے۔ یہ ایک بے حد بامعنی واقعہ تھا اور صرف ایک بامعنی توجیہہ (meaningful explanation) ہی اِس واقعے کی تشریح کرسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی دریافتوں نے انسان کو معرفتِ الٰہی کے عین دروازے تک پہنچا دیا ہے۔ اب صرف اتنا ہی باقی ہے کہ لفظی طور پر اس کا اعتراف کرلیا جائے۔

Universe Origins: Giant Boost for Big Bang Theory

London: An international team of astrophysicists has discovered the signal left in the sky by the super-rapid expansion of space that would have occurred fractions of a second after everything came into being following the Big Bang. Announcing their finding over a global press call, scientists from Harvard Smithsonian Centre for Astrophysics said researchers from the BICEP2 (Background Imaging of Cosmic Extragalactic Polarization) collaboration have found this first direct evidence for this cosmic inflation, a theory pioneered by Prof Alan Guth among others. Almost 14 billion years ago the universe burst into existence in an extraordinary event that initiated the Big Bang, they said. It has been theorized that in the first fleeting fraction of a second the universe expanded exponentially in what is described as the first tremors of the Big Bang, stretching far

beyond the view of our best telescopes. Their data also represents the first images of gravitational waves or ripples in space-time. The team analysed their data for more than three years in an effort to rule out any errors.They also considered whether dust in our galaxy could produce the observed pattern, but the data suggest this is highly unlikely. Harvard theorist Avi Loeb said this work offers new insights into some of our most basic questions: Why do we exist? How did the universe begin??? These results not only offer strong evidence for inflation, they also tell us when inflation took place and how powerful the process was. These ground breaking results came from observations by the BICEP2 telescope of the cosmic microwave background, a faint glow left over from the Big Bang. (The Times of India, New Delhi, March 19, 2014, p. 23)

خلّاق علیم

اللہ رب العالمین کی ایک صفت خلاق علیم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے :
أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ (36:81)۔ یعنی کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کردے۔ ہاں وہ قادر ہے۔ اور وہی ہے بڑا پیدا کرنے والا، جاننے والا۔

اس آیت میں جس طرح خلّاق (the Great Creator) آیا ہے، اسی طرح اس میں علیم سے مراد علّام (the Great Knower) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العالمین خلّاق اور علّام ہے۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی کائنات اپنے آپ میں اس کا ثبوت ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن کی ایک آیت میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (21:30)۔ یعنی کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں رَتق کی حالت میں تھے، پھر ہم نے ان کو فتق کیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔

رَتْق کا مطلب ہے منضم الاجزاء (joined together)، اور فَتْق کا مطلب ہے پھاڑنا (to tear apart)۔ اس آیت کی ابتدا میں أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا (کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ رتق اور فتق کا یہ واقعہ انسان کے لیے مشاہدہ کے درجے میں ایک معلوم واقعہ ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں یہ واقعہ سائنسی دریافتوں کے نتیجے میں علمی طور پر ایک معلوم واقعہ بن چکا ہے۔ جس کو عام زبان میں بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ سائنسی دریافت کے مطابق، بگ بینگ کا واقعہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے خلا (space) میں پیش آیا۔ اس واقعہ کی جو تفصیلات سائنس نے دریافت کی ہے، وہ قرآن کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس دریافت کے مطابق، بگ بینگ کا فلکیاتی واقعہ حیرت انگیز طور پر اس بات کا سائنسی

ثبوت ہے کہ کائنات کا پیدا کرنے والا خلّاق بھی ہے اور علّام بھی۔ یعنی وہ عظیم خالق بھی ہے، اور عظیم جاننے والا بھی۔ کائنات کا پیدا کرنے والا اگر خلّاق (بڑا پیدا کرنے والا) اور علاّم (بڑا علم والا) نہ ہو تو کائنات کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہوجاتا۔ خلّاق اور علّام کے الفاظ صرف پیدائش کی خبر نہیں ہے، بلکہ وہ پیدائش کے واقعہ کی دلیل بھی ہے۔

سائنس نے جس کائناتی واقعہ کو دریافت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے اچانک خلا میں ایک بہت بڑا ایٹم ظاہر ہوا اس سوپر ایٹم (super atom) کے اندر وہ تمام پارٹکل موجود تھے، جن کے مجموعے سے موجودہ کائنات بنی ہے۔ پھر اچانک اس سوپر ایٹم میں بہت بڑا دھماکہ ہوا۔ اس عظیم دھماکے کے بعد سوپر ایٹم کے تمام پارٹکل غیر معمولی تیزی کے ساتھ خلا میں دوڑنے لگے۔ ان کی رفتار (speed) بے حد تیز تھی۔ اگر پارٹکل کا یہ انتشار اسی تیزی کے ساتھ جاری رہتا تو موجودہ کائنات کا بننا ناممکن تھا۔ کیوں کہ اس کے تمام پارٹکل بے حد تیزی کے ساتھ خلا میں منتشر ہوجاتے۔ ان کا اجتماع ناممکن ہوجاتا۔ اس لیے کائنات کا بننا بھی ناممکن ہوجاتا۔

سائنسی دریافت بتاتی ہے کہ سوپر ایٹم کے پھٹنے کے بعد کچھ سیکنڈوں کے اندر پارٹکل کے انتشار کی رفتار اچانک کم ہوگئی۔ رفتار کا یہ کم ہوجانا بے حد اہم تھا۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے منتشر پارٹکل دوبارہ مجتمع ہونے لگے، اور ان کے اجتماع سے تمام ستارے اور کہکشائیں، اور شمسی نظام، وغیرہ، وجود میں آئے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جس ہستی نے سوپر ایٹم میں یہ انفجار برپا کیا، وہ سب سے زیادہ طاقت ور ہونے کے ساتھ سب سے بڑا جاننے والا بھی تھا۔ اس واقعے کا اس کے خالق کو پیشگی علم تھا۔ اس علم کے مطابق اس نے اس معاملے کی پلاننگ کی۔ سیکنڈ کے فریکشن میں ہونے والے اس واقعے کا اس کو پیشگی علم نہ ہوتا تو ساری پلاننگ عبث ہوجاتی، اور کائنات کا وجود میں آنا ناممکن ہوجاتا۔ یہ سائنسی دریافت رب العالمین کے خلّاق وعلّام ہونے کا ایک یقینی ثبوت ہے۔

بگ بینگ، لٹل بینگ

انسان ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہے کہ موجودہ کائنات کیسے بنی۔ وہ عقلی سطح پر اِس کا جواب پانا چاہتا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں پہلی بار انسان کو اِس کا عقلی جواب ملا۔ فلکیاتی سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے، خلا میں ایک انفجار (explosion) ہوا۔ اِس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ فلکیاتی سائنس کے اعتبار سے، اِسی بگ بینگ کے بعد بتدریج موجودہ کائنات وجود میں آئی۔

تاہم ایک سوال کا عقلی جواب ابھی باقی تھا، وہ یہ کہ ہمارا شمسی نظام (solar system) کیسے بنا۔ شمسی نظام، ساری کائنات میں ایک استثنائی نظام ہے۔ اِس نظام کے اندر سیارۂ زمین ایک انتہائی استثنائی قسم کا سیارہ ہے۔ علمائے فلکیات اِس بات کی عقلی توجیہہ نہیں کر سکے تھے کہ کائنات میں استثنائی قسم کا موجودہ شمسی نظام کیسے بن گیا۔

بگ بینگ کی دریافت کے تقریباً سو سال بعد، اکیسویں صدی کے رُبعِ اول میں، سائنس دانوں نے سوئزرلینڈ میں کچھ خصوصی تجربات کیے۔ اِن تجربات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ بگ بینگ کے واقعے کے بہت بعد خلا میں ایک چھوٹا انفجار رہوا۔ اِس کو سائنس دانوں نے لٹل بینگ (Little Bang) کا نام دیا ہے۔ اِس لٹل بینگ کے بعد شمسی نظام وجود میں آیا اور بتدریج وہ استثنائی سیارہ بنا جس کو زمین (planet earth) کہا جاتا ہے۔

بگ بینگ اور لٹل بینگ کی یہ دونوں سائنسی دریافتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی تخلیق ایک اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کے ذریعے ہوئی۔ یہ کائنات کسی اتفاق (accident) کے ذریعے وجود میں نہیں آئی، بلکہ وہ ایک بالقصد منصوبے کے ذریعے وجود میں آئی۔ یہ واقعہ اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات کی ایک منزل ہے۔ یہ کائنات پورے معنوں میں ایک بامعنیٰ کائنات ہے، اور ایک بامعنیٰ کائنات کسی بے معنی انجام پر ختم نہیں ہوسکتی۔

چھ بینگ

بیسویں صدی کے آغاز میں اُس فلکیاتی واقعے کی دریافت ہوئی جس کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ اِس واقعے کو یہ نام برٹش سائنس داں فریڈ ہائل (Fred Hoyle) نے دیا تھا جس کی وفات 2001 میں ہوئی۔ بگ بینگ کے بعد خلا میں جو واقعات پیش آئے، اُن میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کو سولر سسٹم (solar system) کہا جاتا ہے۔ سولر سسٹم کو ایک امریکی سائنس داں الان باس (Alan P. Boss [b. 1951]) نے لٹل بینگ (Little Bang) کا نام دیا۔ تسمیہ (nomenclature) کے اِس اصول کو لے کر میں نے سوچا تو میری سمجھ میں آیا کہ پوری تاریخ میں چھ قسم کے بینگ جیسے واقعات پیش آئے ہیں۔ وہ چھ بینگ یہ ہیں:

(1) بگ بینگ (Big Bang)

(2) شمسی نظام (Little Bang)

(3) واٹر بینگ (Water Bang)

(4) پلانٹ بینگ (Plant Bang)

(5) اینمل بینگ (Animal Bang)

(6) ہیومن بینگ (Human Bang)

سائنس دانوں نے کائنات میں اِس طرح کے چھ ادوار کی نشان دہی نہیں کی ہے، لیکن سائنس نے کائنات کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، اُن کو لے کر جب غور کیا جائے تو بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ کائنات میں تخلیق کا جو عمل ہوا ہے، اُس کے غالباً یہی چھ ادوار ہیں۔ اب تک کی سائنسی معلومات اِس تقسیمِ ادوار کی بظاہر تصدیق کرتی ہیں۔ اِس اعتبار سے چھ ادوار کی تقسیم بالواسطہ طور پر ایک سائنسی تقسیم ہے۔

بگ بینگ، ایک منظم واقعہ

موجودہ زمانے کے فلکیاتی نظریات میں سے ایک نظریہ وہ ہے، جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے کائنات ایک سمٹے ہوئے واحدہ مادے کی صورت میں تھی۔ یہ ابتدائی مادّہ جس کو بعض سائنس دانوں نے ''سپر ایٹم'' کا نام دیا ہے، اس کے تمام اجزاء اندر کی طرف شدت سے کھنچے ہوئے تھے — اس کے بعد اس ابتدائی مادہ مجموعے میں زبردست دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے نتیجے میں اس کے اجزاء چاروں طرف پھیلنے لگے، اور بالآخر موجودہ کائنات اپنے تمام ستاروں اور سیاروں سمیت بن گئی۔

ٹائمس آف انڈیا (11 دسمبر 1977) میں چھپی خبر کے مطابق، کیلی فورنیا کے دو سائنس داں ایسے نئے حقائق تک پہنچے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا دھماکہ (بگ بینگ) اس سے بہت زیادہ پرسکون اور منظم واقعہ (orderly event) تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ امریکا کے خلائی ادارہ ناسا کے ایک اعلامیہ میں ڈاکٹر رچرڈ ملر (Richard A. Muller [b. 1944]) اور ڈاکٹر جارج اسموٹ (George Fitzgerald Smoot [b. 1945]) نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق میں پایا کہ کائنات اپنے چاروں طرف بالکل یکساں رفتار سے پھیل رہی ہے۔

اکثر سائنس داں یہ یقین رکھتے ہیں کہ کائنات ایک عظیم دھماکہ سے شروع ہوئی۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ ایک منتشر حالت تھی، جس سے مادّہ میں ایک بھنور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر جدید شواہد بہ ظاہر بتا رہے ہیں کہ معروف معنوں میں یہ کوئی ''دھماکہ'' نہیں تھا۔ بلکہ اخراج طاقت (energy release) کا ایک پرسکون واقعہ تھا، جس کی حقیقت ابھی ہم سمجھ نہیں سکے۔ یہ اس سے بہت زیادہ پیچیدہ واقعہ تھا جیسا اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔

دونوں سائنس دانوں کے نظریات کی بنیاد وہ بیک گراؤنڈ شعاعیں ہیں جو ناسا کے یو—2 جہاز میں لگے ہوئے نازک آلات نے دریافت کیے ہیں۔ یہ مخصوص جہاز 20 ہزار میٹر کی بلندی تک اڑایا

گیا تھا۔خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شعاعیں ابتدائی دھماکے کے وقت نکلی تھیں۔ان شعاعوں کا علم ابتدا میں 1965 میں ہوا تھا۔یو–2 جہاز نے معلوم کیا ہے کہ یہ شعاعیں کائنات کے ہر حصے میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اتنی نظم وترتیب ہے کہ ان کے ذریعے آسمانی اجرام کی رفتار کو نہایت صحت کے ساتھ ناپ کر معلوم کیا جاسکتا ہے۔

تاہم جو پیمائش کی گئی ہے، ان سے نظم وضبط میں ایک استثنا (exception) کا علم ہوا ہے۔زمین، ہمارا شمسی نظام اور ہماری کہکشاں، جس میں شمسی نظام واقع ہے، بقیہ اجرام سماوی کے مقابلے میں ایک ملین میل فی گھنٹے کی رفتار سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔"یہ صورتِ حال ہمارے مسلمات کے کسی قدر خلاف ہے۔" ڈاکٹر اسموٹ نے کہا "کیوں کہ اگر ہماری کہکشاں بقیہ کائناتی توسیع کے ہم آہنگ ہوتو اس کو موجودہ رفتار کے مقابلے میں 1/6 رفتار سے سفر کرنا چاہیے۔" ہماری کہکشاں کیوں اس طرح استثنائی انداز میں سفر کر رہی ہے، اس کی وجہ ہم نہیں جانتے۔اس بنیادی سوال کا جواب بھی ابھی تک لامعلوم ہے کہ کائنات کے مادہ میں ابتدائی حرکت یا دھماکہ کا آغاز کیوں کر ہوا۔

The 'big bang' was not all that big

WASHINGTON, December 10 (Reuters), TWO California scientists have come up with new data suggesting that the big bang,"which brought the universe into being some 15 billion years ago, was a much smoother and more orderly event than popularly imagined.

In an announcement from the National Aeronautics and Space Administration (NASA) recently, Dr. Richard Muller and Dr. George Smoot of the University of California said they had found that the universe was expanding at a constant rate in almost all directions.

The now findings "take the simplistic big bang theory a long step down the road and give us a model that will eventually help to unravel the mystery of how the universe was formed," Dr Smoot said in an interview.

Most astronomers believe the universe began with a huge explosion, Some think this was a chaotic mess, occurring at different speeds in different places, giving rise to great swirls of matter.

Others see it as a homogeneous event, sending newly formed matter out in all directions in the same speed.

But the new findings seem to indicate that the bang was smoother than even the "homogeneous school" had expected.

It appears, said Dr Smoot, that "there was no explosion such as a Super Nova (large exploding star), but rather some sort of energy release which we don't understand yet.

"We're really giving added weight to the big bang theory. But it is an infinitely more complex process than the originators conceived it to be."

BACKGROUND RADIATION

The two scientists base their ideas on readings of background radiation detected by sensitive instruments aboard a NASA U-2 aircraft at an altitude of 20,000 meters. This plane, a type most famous for spy flights over the Soviet Union and Cuba in the late 1950s and early 60s, is also used for agricultural and earth resources photography, NASA said.

Background microwave radiation, discovered in 1965, is thought to be the heat left over after the bang.

But the U-2 fighters found that the radiation was the same in all sectors of the sky, indicating there is no central core of the universe and have no single primal explosion at one "spot"

The radiation is so regular that it allows the measurement of motion of heavenly bodies just as resistance to water allows ship ship's speed to be measured.

And these measurements reveal one exception to regularity: the earth, our solar system and our galaxy—the Milky Way—are out of step with the rest of the Hydra at more than one million miles per hour.

"This is a slight paradox", Dr. Smont said. "Because if our galaxy was constant with the rest of the universal expansion, it should only be travelling at about one-sixth that rate of speed."

Why the Milky Way is acting this way remains unknown though Dr Bernard Jones of England's Cambridge Institute of Astronomy has suggested that the entire universe might be slightly top sided, with more matter on one side than on the other.

The gravity of this matter could be tugging the Milky Way, but in that case other galaxies would be affected.

The fact remains that the two scientists found none of the swirls of radiation a chaotic explosion might have caused.

The basic Smoot-Muller model of the universe is one of clusters of galaxies moving away from one another at a constant rate towards the end of the universe—if it has ends.

The model, mere complex than idea of a messy explosion still leaves the basic question unanswered: how did the original bang come about?

Some astronomers speculate that it was caused by the collision of matter and anti-matter. This theory holds that there was originally slightly more matter than anti-matter, so some matter was left over after the blast. (The Times of India, December 11, 1977)

ایک تقابل

قرآن میں انسان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ غیب کی بات کو نہیں جانتا: قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ (7:188)۔یعنی کہو، میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کرلیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

یہ انسان کا معاملہ ہے۔ انسان خواہ وہ عام انسان ہو یا پیغمبر، وہ غیب (unseen) کو نہیں جانتا۔یعنی کل کیا ہوگا، اس سے انسان بے خبر ہوتا ہے۔ انسان آج کے علم کے تحت ایک کام کرتا ہے، لیکن کل کیا ہونے والا ہے، اس سے انسان مکمل طور پر بے خبر ہوتا ہے۔ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ آئندہ آنے والے نقصان سے خود کو بچالے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ علّام الغیوب ہے،یعنی چھپی ہوئی باتوں کو بہت زیادہ جاننے والا۔ انسان اور خدا کے درمیان اس فرق سے ایک تقابل کا اصول ملتا ہے۔یعنی وبضدھا تعرف الأشیاء:

It is in comparison that you understand

انسان کا کوئی کام خالی از نقص (free from defect) نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، اللہ رب العالمین کی تخلیق کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں، وہ کامل معنوں میں نقص سے خالی ہیں۔ انسان کی کوئی بھی انڈسٹری نقص (defect) سے پاک نہیں ہوتی، لیکن اللہ رب العالمین کا بنایا ہوا، شمسی نظام مکمل طور پر زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کا نمونہ ہے۔ یہ فرق خالق کے وجود کا ایک یقینی ثبوت ہے۔

اس لیے بیسویں صدی میں ترقی یافتہ ملکوں نے بہت زیادہ کوشش کی کہ وہ اپنی انڈسٹری میں زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کا نظام قائم کریں، جیسا کہ وہ فطرت (nature) کی دنیا میں عملاً قائم ہے۔ مگر اس معاملے میں ان کو مکمل ناکامی ہوئی، اور آخر میں یہ مان لیا گیا کہ انسان کا بنایا ہوا کوئی نظام زیرو ڈیفکٹ نظام نہیں ہوسکتا۔ یہ فرق خالق کے وجود کا ایک یقینی ثبوت ہے۔

بے نقص کائنات

کائنات مکمل طور پر ایک بے نقص (zero-defect) کائنات ہے۔ قرآن میں کائنات کے اس پہلو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: یعنی جس نے بنائے سات آسمان درجہ بدرجہ، تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے، پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے (هَلْ تَرَى مِنْ فُطُور)۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو، نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی (67:3-4)۔

قرآن کی اس آیت میں کائنات کو بے فطور (flawless) کہا گیا ہے۔ جس وقت قرآن میں یہ آیت اتری، اس وقت انسان کو معلوم نہ تھا کہ کائنات ایک بے نقص کائنات ہے۔ انسان سورج چاند کو دیکھتا تھا، سمندروں اور پہاڑوں کو دیکھتا تھا۔ اس سے اس کے اندر ایک تحیر کا احساس (sense of awe) پیدا ہو جاتا تھا۔ اس سے کائنات کی پرستش (nature worship) کا تصور پیدا ہوا۔ خالق کا جو اصل مقصود تھا، وہ یہ تھا کہ انسان کائنات کے بے فطور (flawless) پہلو کو جانے، اور اس طرح خالق کی قدرت کو دریافت کرے۔ مگر ہزاروں سال تک کائنات کا یہ پہلو غیر دریافت شدہ بنا رہا۔

پچھلے تقریباً چار سو سال کے درمیان سائنس کے میدان میں جو دریافتیں ہوئی ہیں، انھوں نے پہلی بار انسان کو بتایا کہ کائنات میں کمال درجے کی معنویت پائی جاتی ہے۔ کائنات ویل پلانڈ (well planned) کائنات ہے، کائنات ایک ویل مینجڈ (well managed) کائنات ہے، کائنات ایک ویل ڈیزائنڈ (well designed) کائنات ہے، کائنات ایک ویل ڈسپلنڈ (well disciplined) کائنات ہے۔ اب سائنسداں عام طور پر یہ مانتے ہیں کہ کائنات ایک انٹلجنٹ کائنات (intelligent universe) ہے۔ حتی کہ اب یہ ایک باقاعدہ موضوع بن گیا ہے، جس پر بہت سی کتابیں اور رسالے شائع کیے جا رہے ہیں۔

نیوٹن کے زمانے میں کائنات کو ایک میکینیکل کائنات کہا جاتا تھا۔ لیکن مزید ریسرچ سے یہ نظریہ غلط ثابت ہوگیا۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں جو ریسرچ ہوئی ہے، اس سے اب یہ بات تقریباً واقعہ (fact) بن چکی ہے کہ کائنات ایک ذہین کائنات (intelligent universe) ہے۔ کائنات کو ذہین کائنات ماننے کے بعد یہ معاملہ ایک لفظی مسئلہ بن جاتا ہے۔ کائنات کو ذہین کائنات ماننا دوسرے لفظوں میں یہ ماننا ہے کہ یہ کائنات ایک ذہین خالق کی تخلیق ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور مفہوم نہیں ہوسکتا۔ اس موضوع پر غالباً پہلی باقاعدہ کتاب فریڈ ہائل (Fred Hoyle) کی تھی، جس کا نام تھا ذہین کائنات:

The Intelligent Universe: A New View of Creation and Evolution (1983)

مگر اب ذہین ڈزائن کے موضوع پر بڑی تعداد میں کتابیں اور مقالے چھپ چکے ہیں۔ ان کتابوں اور مقالات کو کسی بڑی لائبریری میں یا انٹرنیٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

زیروڈفکٹ کائنات

سیکنڈ ورلڈ وار (1945-1939) کے زمانے میں ایک تصور پیدا ہوا، جس کو زیروڈیفکٹ مینجمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے آرٹکل اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ جلد ہی یہ تصور ترقی یافتہ ملکوں میں تیزی سے پھیل گیا۔ کئی ملکوں، مثلاً امریکا اور جاپان، وغیرہ میں اس تصور کو بڑے پیمانے پر عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن لمبے تجربے کے بعد یہ مان لیا گیا کہ زیروڈیفکٹ مینجمنٹ کا تصور ناقابلِ حصول ہے۔ اس موضوع پر انٹرنیٹ میں کافی مواد موجود ہے۔ آپ نمونے کے طور پر حسبِ ذیل آرٹکل پڑھ سکتے ہیں :

The Concept of Zero Defects in Quality Management by Chandana Das (www.simplilearn.com)

دورِ جدید میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے پیمانے پر یہ کوشش کی گئی کہ زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ قائم کیا جائے۔ اس موضوع پر بڑی تعداد میں ریسرچ ہوئی، اور کتابیں لکھی گئیں۔ بیسویں صدی کے تقریباً پورے دور میں یہ کام جاری رہا۔ مگر اس مقصد میں مکمل ناکامی ہوئی۔ حالاں کہ دورِ جدید کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں نے اس عمل میں حصہ لیا۔ مثلاً امریکا اور جاپان، وغیرہ۔ دوسری طرف عین اسی وقت دورِ جدید کے سائنسی مطالعے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ فطرت کا نظام، مثلاً ستاروں اور سیاروں کی گردش، وغیرہ، انتہائی حد تک بے خطا انداز میں قائم ہیں۔ اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ کل ٹھیک ٹھیک کس وقت سورج نکلے گا، اور کس وقت ٹھیک وہ غروب ہوگا، تو آپ آج ہی اس کو نہایت درست انداز میں معلوم کرسکتے ہیں۔

ایک طرف یہ تجربہ ہے کہ انسانی دنیا میں زیروڈیفکٹ مینجمنٹ کا تصور مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے، اور دوسری طرف انسان کے سوا جو مادی دنیا ہے، اس میں یہ تصور کامل طور پر موجود ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ 15 اپریل 2025 کو سورج کے طلوع ہونے، اور غروب ہونے کا وقت کیا ہوگا

تو پیشگی طور پر آپ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ 15 اپریل 2025 کو دہلی میں سورج کے طلوع اور غروب کا وقت حسب ذیل ہوگا :

طلوعِ آفتاب (Sun rise) 05:56 غروبِ آفتاب (Sun set) 18:46

سورج کے طلوع و غروب کا وقت اسی صحت (accuracy) کے ساتھ ساری دنیا کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح پوری مادی دنیا کا نظام کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے۔ مادی دنیا کی سائنس کو اسٹرانومی، فزکس، کیمسٹری، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس مادی دنیا کا ریکارڈ ہزاروں سال پہلے، اور ہزاروں سال بعد تک معلوم کیا جا سکتا ہے، اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر وہ یہی رہے گا۔ اس دنیا کے بارے میں اب تک کوئی فرق ریکارڈ نہیں کیا گیا ہے۔

آپ غور کیجیے کہ وہ مادی دنیا جو براہ راست خالق کے مینجمنٹ کے تحت چل رہی ہے، وہ شروع سے اب تک اسی زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کے اصول پر قائم ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کی دنیا میں، انسان جو منصوبہ بناتا ہے، مثلاً انڈسٹری کی دنیا، وہاں انتہائی کوشش کے باوجود زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کا نظام قائم نہ ہو سکا۔ یعنی ایک طرف اسپیس میں ڈیوائن مینجمنٹ کو دیکھیے، جو زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کے اصول پر مسلسل چل رہا ہے۔ دوسری طرف ہیومن مینجمنٹ کو دیکھیے۔ اس دوسری دنیا میں تقریباً ایک صدی کی مسلسل کوشش کے باوجود زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کا نظام قائم نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں اگر آپ کو ہیومن مینجمنٹ کا تجربہ جاننا ہو، تو آپ انٹرنیٹ پر موجود اس مضمون کو پڑھیے :

Zero Defects, a term coined by Mr. Philip Crosby in his book"Absolutes of Quality Management" has emerged as a popular and highly-regarded concept in quality management—so much so that Six Sigma is adopting it as one of its major theories. Unfortunately, the concept has also faced a fair degree of criticism, with some arguing that a state of zero defects simply cannot exist. Others have worked hard to prove the naysayers wrong, pointing out that "zero defects" in quality management doesn't literally

mean perfection, but rather refers to a state where waste is eliminated and defects are reduced. It means ensuring the highest quality standards in projects. What Do We Mean by Zero Defects: From a literal standpoint, it's pretty obvious that attaining zero defects is technically not possible in any sizable or complex manufacturing project.

(www.simplilearn.com. accessed on 13.03.19)

اب اس دوطرفہ تجربے کے اوپر مشہور فارمولے کو منطبق (apply) کیجیے کہ چیزیں اپنی ضد سے سمجھ میں آتی ہیں (تعرف الاشیاء باضدادھا):

It is in comparison that you understand

قرآن کی مختلف آیتوں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان موجودہ دنیا میں جو نظام بناتا ہے، اور انسان کے باہر بقیہ کائنات میں جو نظام ہے، دونوں میں تقابل کرکے دیکھو۔ یہ تقابلی مطالعہ (comparative study) بتائے گا کہ دونوں دنیاؤں میں بنیادی فرق ہے۔ انسان کی دنیا میں انسان جو نظام بناتا ہے، اس میں ساری کوشش کے باوجود زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کا نظام قائم نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ یہ مان لیا گیا کہ انسان کی دنیا میں اس تصور کا حصول ممکن نہیں۔ دوسری طرف خدا کی قائم کردہ مادی دنیا میں یہ تصور پوری تاریخ میں انتہائی صحت (accuracy) کے ساتھ قائم ہے۔

اس فرق پر جب مذکورہ فارمولا کو منطبق کیا جائے تو خود انسانی تجربے کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کا مالک ایک برتر ہستی ہے، یعنی اللہ رب العالمین۔ انسان کی دنیا اور فزیکل سائنس (exact sciences) کی دنیا میں جو فرق ہے، وہ فرق خدا کے وجود کا ایک قطعی ثبوت ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (67:3-4)۔ یعنی جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے، تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے، پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا

ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو، نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی۔

اسی طرح ایک آیت یہ ہے: أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ (50:6)۔یعنی کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، ہم نے کیسا اس کو بنایا اور اس کو رونق دی اور اس میں کوئی رخنہ نہیں۔ موجودہ زمانے میں کائنات کے بے خطا نظام کی یہ دریافت (discovery) اللہ رب العالمین کی ایک صفت کو ثابت شدہ بنا رہی ہے، اور وہ ہے: الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ (2:255)۔یعنی وہ زندہ ہے، سب کو چلانے والا ہے۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے، اور نہ نیند۔

علمی شہادت

خدا کے بغیر کائنات بے تعبیر

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) بیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنس داں مانا جاتا ہے۔ وہ 1879 میں جرمنی میں پیدا ہوا، اور 1955 میں امریکا میں اس کی وفات ہوئی۔ 1921 میں اس کو فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

البرٹ آئن سٹائن نے عالم مادّی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے مطالعے میں پایا کہ کائنات ایک بے حد بامعنیٰ وجود ہے۔ اُس کے ہر پہلو میں اتھاہ حکمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ حکمت ومعنویت کائنات میں کہاں سے آئی۔ آئن سٹائن نے کائنات کی بے پایاں حکمت کو دریافت کیا، لیکن اُس کے حکیم کو وہ دریافت نہ کرسکا۔ اُس نے تعجب کے ساتھ کہا— کائنات کے بارے میں سب سے زیادہ حسین تجربہ جو ہم کو ہوتا ہے، وہ پُراسراریت کا تجربہ ہے:

The most beautiful experience we can have is the mysterious.

البرٹ آئن سٹائن کا ایک دوسرا قول اِس معاملے میں یہ ہے— فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے قابلِ فہم ہے:

The most incomprehensible thing about the universe is that it is comprehensible.

سائنس داں کو یہ مشکل کیوں پیش آئی۔ اِس لیے کہ کائنات کی معنویت (meaning) کو تو اُس کے دماغ نے دریافت کیا، لیکن اِس معنوی نظام کے خالق کو وہ دریافت نہ کرسکا۔ اس بنا پر وہ تعجب کے ساتھ کہتا ہے کہ جب کائنات کی معنویت انسان کے لیے قابلِ مشاہدہ ہے تو اس کے لیے وہ ہستی کیوں ناقابلِ مشاہدہ ہے، جس نے کائنات میں اِس معنویت کو پیدا کیا ہے، جب حکمت موجود ہے تو آخر اس کا حکیم کہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے عقیدے کے بغیر کائنات بے معنیٰ بن جاتی ہے۔ یہ صرف خدا کا عقیدہ ہے جو کائنات کی معنویت کو انسان کے لیے قابلِ فہم بناتا ہے۔

ایک علمی ملاقات

30 مارچ 2008 کی شام کو دو اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ ایک، مشہور برطانی جنرلسٹ سر مارک تلی (Sir Mark Tully)، اور دوسرے، برطانیہ کے ایک مسیحی عالم (Bishop of Kingston) اور ڈاکٹر رِچرڈ (Dr. Richard Cheetham)۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن سے اسلام کے مختلف موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

سر مارک تلی نے کہا کہ اسلام کے اعتقادی نظام میں ایک خدا کے عقیدے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ ہے، یا خدا کے وجود کا کوئی سائنسی ثبوت بھی ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں کوئی عقیدہ محض ادّعائی عقیدہ (dogmatic belief) نہیں ہوتا، اسلام کے اعتقادی نظام فطرت کے اٹل اصولوں پر قائم ہے۔ اِسی کو موجودہ زمانے میں سائنسی بنیاد (scientific base) کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ 1920 سے پہلے جو نیوٹنین میکانکس (Newtonian Mechanics) تھی، اس کے مطابق، مادّہ (matter) کی آخری اکائی (unit) ایٹم تھا۔ اُس وقت ایٹم (atom) ناقابلِ تقسیم سمجھا جاتا تھا۔ اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر چیز قابلِ مشاہدہ ہے، اِس لیے معقول استدلال (valid argument) وہی ہے، جو براہِ راست استدلال کے اصول پر مبنی ہو۔

مگر 1920 کے بعد نیوکلیر سائنس (nuclear science) میں جو نئی تحقیقات ہوئیں، اس کے نتیجے میں ایٹم ٹوٹ گیا۔ اب کلاسکل فزکس (classical physics) کی جگہ ویو میکانکس (wave mechanics) وجود میں آئی۔ اِس تبدیلی کا اثر اصولِ استدلال پر پڑا۔ اِس نئی دریافت نے استنباطی استدلال (inferential argument) کی اہمیت بڑھا دی۔ اب یہ مان لیا گیا کہ استنباطی استدلال بھی اتنا ہی ویلڈ آرگومنٹ ہے، جتنا کہ براہِ راست استدلال (directargument)۔

استدلال کی بنیاد کی اِس تبدیلی کے بعد خدا کے عقیدے پر استدلال قائم کرنا اتنا ہی ممکن ہو گیا ہے، جتنا کہ الیکٹران پر استدلال قائم کرنا۔ جیسا کہ معلوم ہے، الیکٹران کے وجود کو استنباطی دلیل کے

ذریعے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہی استنباطی استدلال اب خدا کے وجود کو علمی طور پر ثابت کرنے کے لیے بھی حاصل ہو گیا ہے۔ چنانچہ برٹرینڈرسل (وفات 1970) نے ڈزائن سے استدلال (argument from design) کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک سائنسی استدلال قرار دیا ہے۔

میری اِس بات کو سن کر ڈاکٹر رچرڈ نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ موجودہ طبیعیاتی علما (physicists) اِس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ کائنات کی حد درجہ معنویت اِس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ موجودہ کائنات کسی ذہن (mind) کی تخلیق ہے، لیکن علمائے حیاتیات (biologists) اِس کی تائید نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ بطور واقعہ آپ کا کہنا صحیح ہے، لیکن علمائے حیاتیات کی یہ رائے کسی سائنسی حقیقت پر مبنی نہیں، ان کی یہ رائے تمام تر ایک غلط مفروضے پر قائم ہے۔ چارلس ڈارون (وفات 1802) نے اِس معاملے میں ایک غلط مفروضہ پیش کیا اور پھر تمام لوگوں نے اِس مفروضے کو بطور حقیقت مان لیا۔ ڈارون نے زندگی کے مختلف نمونوں کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اُس نے پایا کہ ہماری زمین پر بہت سی انواعِ حیات (species) پائی جاتی ہیں، مگر ان کے جسمانی ڈھانچے میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔ مثلاً بلّی اور شیر کے ڈھانچے میں مشابہت، بکری اور زرافہ کے ڈھانچے میں مشابہت، انسان اور بندر کے ڈھانچے میں مشابہت، وغیرہ۔ اِن مشابہتوں (similarities) کو لے کر ڈارون نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ یہاں نیچرل سلیکشن (natural selection) کے اصول کے تحت، ایک ارتقائی عمل (evolutionary process) ہوا ہے۔ اِس ارتقائی عمل کے تحت، ایک نوع دوسری نوع میں خود بخود تبدیل ہو رہی ہے۔

میں نے کہا کہ اِس معاملے میں ڈارون کی غلطی یہ تھی کہ اس نے مختلف انواعِ حیات کے درمیان اِن مشابہتوں کی غلط توجیہہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مشابہتیں زندگی میں تنوّع (varieties) کو بتاتی ہیں، نہ کہ مفروضہ ارتقائی عمل کو۔ ہم متنوّع اقسامِ حیات کو دیکھ رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے تنوع کا نظریہ اپنے آپ ثابت شدہ ہے۔ اِس کے مقابلے میں ارتقائی عمل کا تصور محض ایک قیاس ہے، جس کے حق میں کوئی واقعی ثبوت موجود نہیں۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔

خدا کا وجود

(یہ تقریر انگریزی زبان میں 9 مئی 2009 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں کی گئی)

آج کی شام کے لیے جو موضوع ہے، وہ یہ ہے — خدا کی دریافت کس طرح کی جائے:

How to discover God?

خدا کی دریافت کا معاملہ کوئی اکیڈمک معاملہ نہیں، یہ ہر انسان کا ایک ذاتی سوال ہے۔ ہر عورت اور مرد فطری طور پر اُس ہستی کو جاننا چاہتے ہیں جس نے اُن کو وجود دیا۔ میں بھی دوسروں کی طرح، اِس سوال سے دوچار رہا ہوں۔ میری پیدائش ایک مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اِس کے اثر سے میں روایتی طور پر خدا کو ماننے لگا۔ بعد کو جب میرے شعور میں پختگی (maturity) آئی تو میں نے چاہا کہ میں اپنے اِس عقیدے کو ریزن آؤٹ (reason out) کروں۔ اِس معاملے کی تحقیق کے لیے میں نے تمام متعلق علوم کو پڑھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خدا کا موضوع تین علمی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے — فلسفہ، سائنس اور مذہب۔ یہاں میں فلسفہ اور سائنس کی نسبت سے اپنے کچھ تجربات بیان کروں گا۔

سب سے پہلے مجھے فلسفہ میں اِس سوال کا ایک جواب ملا۔ مطالعے کے دوران میں نے فرانس کے مشہور فلسفی رینے ڈیکارٹ (وفات 1650) کو پڑھا۔ وہ انسان کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا — میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں:

I think, therefore I am.

ڈیکارٹ کا یہ فارمولا جس طرح انسان کے وجود پر منطبق ہوتا ہے، اُسی طرح وہ خدا کے وجود کے لیے بھی قابلِ انطباق (applicable) ہے۔ میں نے اِس قول پر اضافہ کرتے ہوئے کہا — انسان کا وجود خدا کے وجود کو قابلِ فہم بناتا ہے:

Existence of man makes the existence of God understandable.

خدا کے وجود کے بارے میں یہ میرا پہلا فلسفیانہ استدلال تھا۔ میں نے کہا— میرا وجود ہے، اِس لیے خدا کا بھی وجود ہے :

I am, therefore God is.

فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریباً تمام فلسفی کسی نہ کسی طور پر ایک برتر ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ''خدا'' کا لفظ استعمال کرنے سے احتراز کیا، لیکن کچھ دوسرے الفاظ بول کر وہ خدا جیسی ایک ہستی کی موجودگی کا اعتراف کرتے رہے۔ مثلاً جرمنی کے مشہور فلسفی فریڈرک ہیگل (وفات 1831) نے اِس برتر ہستی کو ورلڈ اسپرٹ (world spirit) کا نام دیا، وغیرہ۔

اِس کے بعد میں نے چاہا کہ میں سائنسی طریقِ استدلال (scientific method) کے ذریعے اِس معاملے کی تحقیق کروں۔ سائنسی مطالعے میں جو مسلّمہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر اس مشاہداتی استدلال کے دو دور ہیں۔ سائنس کا مطالعہ جب تک عالمِ کبیر (macro world) تک محدود تھا، اُس وقت تک اِس استدلال کا صرف ایک طریقہ رائج تھا۔ لیکن جب سائنس کا مطالعاتی سفر عالمِ صغیر (micro world) تک پہنچ گیا تو اِس استدلال میں ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ یہ کہ پہلے اگر مشاہداتی استدلال (observationalargument) کو درست مانا جاتا تھا، تو اب استنباطی استدلال (inferential argument) کو بھی یکساں طور پر درست (valid) مانا جانے لگا، یعنی پہلے اگر آرگومینٹ فرام سین ٹو سین (argument from seen to seen) کا اصول رائج تھا تو اب آرگومینٹ فرام سین ٹو اَن سین (argument from seen to unseen) کا اصول بھی درست استدلال کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ اِن دونوں طریقوں کو فنی زبان میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

1. Observation, hypothesis, verification
2. Hypothesis, observation, verification

ایک سادہ مثال سے اس معاملے کی عملی وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً آپ سیب کو شمار کرنا چاہتے

ہیں تو آپ کہتے ہیں— دوسیب جمع دوسیب، برابر چار سیب۔ یہ مشاہداتی استدلال کی ایک مثال ہے۔ دوسرے استدلال کی مثال یہ ہے کہ نیوٹن (وفات 1727) نے دیکھا کہ ایک سیب درخت سے گر کر نیچے آیا۔ یہ ایک مشاہدہ تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کیا کہ سیب درخت سے ٹوٹ کر اوپر کیوں نہیں گیا، وہ نیچے کیوں آ گیا۔ اِس سوچ کے بعد وہ ایک استنباط تک پہنچا، وہ یہ کہ زمین میں قوتِ کشش ہے۔ اِس کے بعد اس نے دوسرے متعلق شواہد (relevant data) کا جائزہ لیا تو اِس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس کا استنباط درست (valid) تھا۔

سائنسی متھڈالوجی کو سمجھنے کے لیے میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ مشہور برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل (وفات 1970) کی کتاب ہیومن نالج (Human Knowledge) ہے۔ اِس کتاب میں مصنف نے بتایا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں— چیزوں کا علم، سچائیوں کا علم:

Knowledge of things, knowledge of truths

چیزوں کی دریافت میں مشاہداتی طریقِ استدلال کارآمد ہے، لیکن خدا کے وجود کا معاملہ سچائی کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس لیے اس معاملے میں وہی استدلال قابل انطباق ہے، جس کو استنباطی استدلال (inferential argument) کہا جاتا ہے۔

غالباً 1965 کی بات ہے، میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی۔ وہ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اُن سے خدا کے وجود کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین کیا ہے:

What criterion do you have to prove the existence of God.

میں نے جواب دیا— وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس اِس نوعیت کی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے ہو:

Same criterion that you have to prove anything else.

اِس کے بعد میں نے اُن کے سامنے مذکورہ طریقِ استدلال کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ خدا کے وجود کا معاملہ سچائی (truth) کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ سچائی کی نوعیت کی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے جس کرائٹیرین کو استعمال کرتے ہیں، اُسی کرائٹیرین کو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیجیے، اور پھر آپ جان لیں گے کہ خدا کا وجود بھی اُسی علمی معیار سے ثابت ہوتا ہے، جس علمی معیار سے اِس نوعیت کی دوسری چیزیں ثابت ہورہی ہیں۔

سنجیدہ اہلِ علم نے اِس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً برٹرینڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ تھیالوجین عام طور پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے وہ طریقہ استعمال کرتے ہیں جس کو ڈزائن سے استدلال (argument from design) کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے مطابق، یہ طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پورے معنوں میں سائنسی منطق (scientific logic) پر مبنی ہے۔ اِس لیے یہ استدلال اصولی طور پر اتنا ہی حقیقی ہے، جتنا کہ کوئی دوسرا سائنسی استدلال۔ اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے:

Where there is design, there is designer and when designer is proved, the existence of God is also proved.

اشیا کا سائنسی مطالعہ 1609 میں شروع ہوا، جب کہ اطالوی سائنس داں گلیلیو گلیلی (وفات 1642) نے ابتدائی دوربین (telescope) کے ذریعے ستاروں کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد دوربینی مشاہدے میں مزید ترقی ہوئی، یہاں تک کہ 1949 میں پیلومر آبزرویٹری (کیلی فورنیا) قائم ہوئی، جس کے ذریعے زیادہ بڑے پیمانے پر آسمانی مشاہدہ ممکن ہوگیا۔ اِس کے بعد الیکٹرانک دوربین ایجاد ہوئی جس کو 1990 میں امریکا کی ہبل آبزرویٹری میں نصب کیا گیا۔

اِس قسم کے مطالعے کے ذریعے معلوم ہوا کہ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے خلا میں بگ بینگ کا واقعہ ہوا جس کے بعد ستاروں اور سیاروں کی موجودہ دنیا وجود میں آئی۔ اِس کے بعد تقریباً ایک بلین سال پہلے لٹل بینگ (little bang) ہوا جس کے ذریعے موجودہ شمسی نظام (solar system) وجود میں آیا۔ اس کے بعد سیارۂ ارض پر واٹر بینگ (water bang) ہوا اور زمین پانی سے بھر گئی۔

اس کے بعد زندگی اور زندگی سے متعلق تمام چیزیں پیدا ہوئیں۔

اِن کائناتی حقیقتوں (signs) کو دیکھ کر ایک آسٹرین سائنس داں بولٹزمن (Ludwig Eduard Boltzmann [1844-1906]) نے کہا تھا— کیا یہ خدا تھا، جس نے ان نشانیوں کو لکھا، جو میرے اردگرد کے نیچر کی پراسرار اور پوشیدہ فورسز کو ظاہر کرتی ہیں، جس سے میرے دل میں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے:

> Was it a God that wrote these signs, revealing the hidden and mysterious forces of nature around me, which fill my heart with quiet joy?
>
> (www.eoht.info/page/Ludwig+Boltzmann [30.03.2020])

بگ بینگ کے واقعہ کے مزید مطالعے کے لیے 1989 میں امریکا کے خلائی ادارہ ناسا (NASA) نے ایک خصوصی سیٹلائٹ (Cosmic Background Explorer) خلا میں بھیجا۔ اِس سیٹلائٹ نے بالائی خلا کی جو تصویریں بھیجی ہیں، اُن سے معلوم ہوا ہے کہ کائنات کے بیرونی حصے میں لہردار سطح (ripples) موجود ہیں۔ یہ بات صرف بگ بینگ سے نکلی ہوئی لہروں تک محدود نہیں ہے، بلکہ کائنات میں پھیلی ہوئی بے شمار چیزوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایک سنجیدہ انسان جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بولٹزمن کی طرح کہہ اٹھتا ہے— کیا یہ خدا تھا، جس نے ان نشانیوں کو لکھا:

> Was it a God that wrote these signs?

کائنات کا جب سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات ایک بے نقص (zero-defect) کائنات ہے۔ وسیع خلا میں بے شمار ستارے اور سیارے مسلسل طور پر حرکت میں ہیں، مگر ہمارے شہروں کے برعکس، خلا میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا۔ گویا کہ عظیم خلا میں نہایت وسیع پیمانے پر ایک ایکسڈنٹ فری ٹریفک (accident-free traffic) قائم ہے۔ ہماری زمین پر نیچر ہر لمحہ بہت سے واقعات ظہور میں لا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عظیم صنعتی نظام ہے۔ مگر یہ نظام زیرو ڈیفکٹ انڈسٹری (zero-defect industry) کی سطح پر چل رہا ہے۔ یہ بے مثال کائناتی کنٹرول اور یہ آفاقی توازن پکار رہا ہے کہ بلاشبہ اِس کے پیچھے ایک عظیم خدا ہے، جو اِن واقعات کو ظہور میں لا رہا ہے۔

کائنات میں واضح طور پر ایک ذہین منصوبہ بندی (intelligent planning) پائی جاتی ہے۔ ایک چھوٹے ذرے سے لے کر عظیم کہکشانی نظام تک یہ منصوبہ بندی نمایاں طور پر ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ یہ منصوبہ بندی بلا شبہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات کے پیچھے ایک بہت بڑا ذہن (mind) کارفرما ہے۔ یہ عقیدہ اتنا ہی سائنسی ہے، جتنا کہ ایکس رے کی قابلِ مشاہدہ تصویر کو دیکھ کرنا قابلِ مشاہدہ ایکس ریز (X-Rays) کے وجود کو ماننا۔

موجودات کے مشاہدے سے ایک عظیم حقیقت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس میں جگہ جگہ یکسانیت کے ساتھ استثنا (exception amidst uniformity) کی مثالیں موجود ہیں۔ استثنا اُس کو کہا جاتا ہے جو عام قانون کے خلاف ہو، جو عام قانون کی پابندی نہ کرے:

Exception: That does not follow the rule.

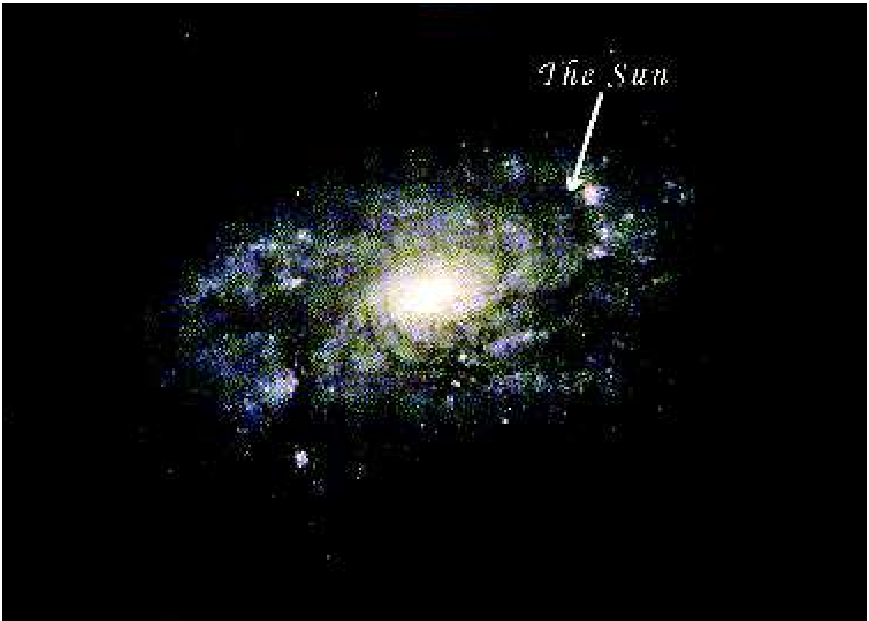
نیچر میں اِس معاملے کی ایک سادہ مثال یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ یہ انگلیاں ہر ایک میں یکساں طور پر ہوتی ہیں۔لیکن ہر ایک کے ہاتھ میں اس کے انگوٹھے کا نشان (finger print) ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا نشان دوسرے کے نشان سے الگ ہوتا ہے۔ اِس عموم میں یہ استثنا ایک برتر ہستی کی بالقصد مداخلت کے بغیر ممکن نہیں۔

نیچر میں اِس قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق، خلا میں تقریباً 125 بلین کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر کہکشاں (galaxy) کے اندر تقریباً 200 بلین ستارے پائے جاتے ہیں۔لیکن شمسی نظام (solar system) ایک استثنائی نظام ہے جو صرف ہماری اُس قریبی کہکشاں میں پایا جاتا ہے، جس کو ملکی وے (milky way) کہا جاتا ہے۔عظیم کائنات میں یہ استثنا ایک طاقت ور ہستی کی بالقصد مداخلت کے بغیر نہیں ہوسکتا:

> Exception means intervention, and when intervention is proved, intervenor is also proved. And intervenor is only the other name of God.

ہماری کہکشاں جس میں شمسی نظام واقع ہے، وہ اِس نوعیت کی ایک انوکھی مثال ہے۔ مطالعہ

بتا تا ہے کہ اِس کہکشاں کا درمیانی حصہ نا قابلِ برداشت حدتک گرم ہے۔ اگر ہمارا شمسی نظام، کہکشاں کے درمیانی حصے میں ہوتو ہماری زمین پر کسی قسم کی زندگی اور نباتات کا وجود ہی ممکن نہ رہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہمارا شمسی نظام، کہکشاں کے ایک کنارے واقع ہے۔ اِس بنا پر وہ کہکشاں کے پُرخطر درمیانی ماحول کے اثر سے بچا ہوا ہے۔ یہ استثنا واضح طور پر ایک منصوبہ بند مداخلت کا ثبوت ہے، اور منصوبہ بند مداخلت بلاشبہ خدائے برتر کی موجودگی کا ثبوت ہے۔



You can see the approximate location of our solar family in another spiral galaxy similar to ours. The centre of the galaxy is a very dangerous place. Being in the outskirts of the galaxy, we can live safely from the hectic activities at the centre.

ہمارے شمسی نظام کے اندر بہت سے سیارے (planets) پائے جاتے ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک سیارہ وہ ہے جس کو زمین کہا جاتا ہے۔ دوسرے تمام سیارے اپنے مدار (orbit) پر گھومتے ہیں۔ مگر ہماری زمین اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے اپنے محور (axis) پر بھی گھومتی ہے۔ زمین کی یہ دہری گردش (double-rotation) ایک انتہائی استثنائی گردش ہے، جو کسی بھی ستارے

یا سیارے میں نہیں پائی جاتی۔ یہ استثنا اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کے پیچھے ایک ایسے برتر عامل کو تسلیم کیا جائے جس نے اپنی خصوصی مداخلت کے ذریعے یہ بامعنیٰ استثنا خلا میں قائم کر رکھا ہے۔

ہماری زمین پر استثنا کی ایک ایسی انوکھی مثال پائی جاتی ہے، جو ساری کائنات میں کہیں بھی موجود نہیں، یہ لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ہے۔ اِس لائف سپورٹ سسٹم کے بغیر زمین پر انسان کا یا کسی اور نوعِ حیات کا وجود ممکن نہ تھا۔ لائف سپورٹ سسٹم کا یہ استثنائی انتظام خدا کی موجودگی کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کا انکار کوئی سنجیدہ انسان نہیں کر سکتا۔

البرٹ آئن سٹائن (وفات 1955) کو بیسویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا سائنسی دماغ مانا جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے کائنات کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اُس نے کائنات کے ہر حصے میں حیرت ناک حد تک معنویت (meaning) پائی۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا — عالم فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ وہ قابلِ فہم ہے:

The most incomprehensible fact about nature is that it is comprehensible.

آئن سٹائن اپنے اِس قول میں بالواسطہ طور پر خدا کے وجود کا اقرار کر رہا ہے۔ اگر اس کے قول کو بدل کر کہا جائے تو وہ اِس طرح ہوگا — خدا کے بغیر عالمِ فطرت مکمل طور پر ناقابلِ فہم رہتا ہے، اور خدا کے ساتھ عالمِ فطرت مکمل طور پر قابلِ فہم بن جاتا ہے:

Without God, nature is totally inocmprehensible, and with God, nature becomes totally comprehensible.

کائنات بلاشبہ ایک بامعنیٰ کائنات (meaningful world) ہے۔ سائنس داں وہ لوگ ہیں، جو کائنات کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عام انسان کے مقابلے میں کائنات کی معنویت سے بہت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ سائنس دانوں نے عام طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ سائنس داں اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر ’’خدا‘‘ (God) کا لفظ بولنے سے احتراز کرتے ہیں۔ لیکن نام کے بغیر وہ اِس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

مثلاً برٹش سائنس داں سر جیمز جینز (وفات 1947) نے اپنی کتاب (The Mysterious Universe) میں کہا ہے کہ کائنات ایک ریاضیاتی ذہن (mathematical) کی شہادت دیتی ہے۔ برٹش عالمِ فلکیات سر فریڈ ہائل (وفات 2001) نے اس حقیقت کا اعتراف یہ کہہ کر کیا ہے کہ ہماری کائنات ایک ذہین کائنات (intelligent universe) ہے۔ امریکی سائنس داں پال ڈیویز (Paul Davis) نے اقرار کیا ہے کہ کائنات کے پیچھے ایک باشعور ہستی (conscious being) موجود ہے۔ برٹش سائنس داں سر آرتھر اڈنگٹن (وفات 1944) نے اِس حقیقت کا اعتراف یہ کہہ کر کیا ہے کہ کائنات کا مادّہ ایک ذہین مادہ ہے:

The stuff of the world is mind-stuff

خدا کا وجود بلاشبہ اُسی طرح ایک ثابت شدہ واقعہ ہے، جس طرح کوئی اور ثابت شدہ واقعہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا وجود صرف ایک پُراسرار عقیدہ کی بات نہیں۔ خدا کا وجود اُسی طرح ایک علمی مسلّمہ ہے، جس طرح کوئی اور علمی مسلّمہ۔ اب یہ سوال ہے کہ خدا ایک ہے یا کئی خدا ہیں، جو کائنات کی تخلیق اور اس کے انتظام کے ذمّے دار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا کا عقیدہ شرک پر مبنی ہے یا توحید پر۔ اِس معاملے میں علم کا فیصلہ مکمل طور پر توحید کے حق میں ہے۔

برٹش سائنس داں نیوٹن کو جدید سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ نیوٹن سے پہلے دنیا میں توہمات (superstitions) کا زور تھا۔ اُس وقت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ خداؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثلاً سن گاڈ (sun god)، مون گاڈ (moon god)، رین گاڈ (rain god)، وغیرہ۔ نیوٹن نے اِس معاملے کا سائنسی مطالعہ کیا۔ اُس نے کہا کہ چار طاقتیں (forces) ہیں، جو کائنات کے نظام کو کنٹرول کرتی ہیں۔ وہ چار طاقتیں یہ ہیں:

(1) قوتِ کشش (gravitational force)

(2) برقی مقناطیسی قوت (electromagnetic force)

(3) طاقت ور نیوکلیر قوت (strong nuclear force)

(4) کم زور نیوکلیر قوت (weak nuclear force)

مگر سائنسی مطالعے کے ذریعے جو دنیا دریافت ہوئی، اُس میں اتنی زیادہ ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی تھی کہ یہ ناقابلِ تصور تھا کہ اتنی زیادہ ہم آہنگ کائنات کو کئی طاقتیں کنٹرول کررہی ہوں۔ اِس لیے سائنسی ذہن اِس تعدّد پر مطمئن نہ تھا۔ مختلف سائنس داں اِس تعداد کو گھٹانے کے لیے کام کررہے تھے، یہاں تک کہ 1979 میں ایک نئی تحقیق سامنے آئی۔ اِس تحقیق کے مطابق، کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں چار نہیں تھیں، بلکہ وہ صرف تین تھیں۔ اِس دریافت تک پہنچنے والے تین نوبل انعام یافتہ سائنس داں تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں:

Sheldon Glashow (b. 1932), Steven Weinberg (b. 1933) Dr. Abdussalam (d. 1996)

تاہم سائنسی ذہن تین کی تعداد پر بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ اِس تعداد کو مزید گھٹا کر ایک تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ کام برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (1942-2018) کے ذریعے انجام پایا۔ اسٹفن ہاکنگ کو نظریاتی سائنس میں بہت بڑا زندہ سائنس داں مانا جاتا ہے۔ اس نے پیچیدہ ریاضیاتی حساب (mathemeticalcalculations) کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ صرف ایک طاقت (force) ہے، جو پوری کائنات کو کنٹرول کررہی ہے۔ یہ نظریہ اب تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان ایک مسلّمہ کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ عمومی زبان میں اس کو سنگل اسٹرنگ نظریہ (single string theory) کہا جاتا ہے۔

سنگل اسٹرنگ نظریہ گویا کہ ایک خدا (توحیدِ الٰہ) کے عقیدے کے حق میں ایک سائنسی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہ مذہبی عقیدے کو علمی مسلّمہ کی حیثیت دے رہا ہے۔ اب خالص سائنس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس کائنات کا ایک خدا ہے۔ یہ خدا ایک ہے اور صرف ایک:

The concept of God is purely a scientific concept, and this God is one and one alone.

ایک سوال

9 مئی 2009 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں خدا کے وجود کے موضوع پر انگریزی زبان میں آپ کی ایک تقریر تھی۔ میں اِس تقریر میں شروع سے آخر تک شریک رہا۔ میں نے دیکھا کہ سامعین نے خدا کے وجود پر دیے گئے سائنسی دلائل سے پورا اتفاق کیا۔ تاہم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سینئر ہندو خاتون نے تقریر کے بعد مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب کی بات سے مجھ کو پورا اتفاق ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ خدا کے وجود پر سائنسی دلائل کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ خدا تو ہمارے اندر موجود ہے۔ براہِ کرام، اِس معاملے کی وضاحت فرمائیں (محمد ذکوان ندوی، نئی دہلی)

جواب

مذکورہ خاتون نے جو بات کہی، وہ کوئی سادہ بات نہیں تھی۔ اصل یہ ہے کہ خدا کے بارے میں دو الگ الگ تصور (concept) پائے جاتے ہیں۔ ایک ہے، توحید (monotheism)، یعنی خدا کو ایک شخصی وجود (personal God) کے طور پر ماننا۔ اور دوسرا ہے وحدتِ وجود (monism) کا تصور، یعنی خدا کو غیر شخصی ہستی (impersonal God) کے طور پر ماننا۔ یہ وہی چیز ہے، جس کو کچھ دوسرے لوگ داخل میں بسا ہوا خدا (indwelling god) کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

وحدتِ وجود کو سنسکرت میں اُدوئت واد کہا جاتا ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا ایک اسپرٹ ہے، جس طرح قوتِ کشش (gravity) ایک اسپرٹ ہے۔ وہ ہر ایک چیز کے اندر موجود ہے۔ وحدتِ وجود کے نظریے کو اگرچہ مسلم صوفیوں نے اختیار کرلیا، لیکن میرے نزدیک وہ سرتاسر ایک بے اصل (baseless) نظریہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ وجود کوئی مذہبی تصور نہیں، وہ صرف ایک فلسفیانہ تصور ہے جس کو مذہب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اسی بنا پر ہندو مذہب میں اِس اعتبار سے سخت تضاد پیدا ہوگیا ہے۔ ایک طرف وہ نِراکار خدا (formless god) کو مانتے ہیں اور دوسری طرف وہ دیوتاؤں کی مورتی بنا کر اُس کو آکار (form) کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانے میں سائنس نے کائنات کا جو مطالعہ کیا ہے، اُس سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے

کہ کائنات کی تخلیق اوراس کے انتظام میں ایک برتر ذہن (superior mind) کام کر رہا ہے، جس کو ایک سائنس داں نے شعوری وجود (conscious being) کا نام دیا ہے۔ اِس طرح سائنس کی دریافتوں نے وحدتِ وجود کے تحت مفروضہ تصورِ خدا کی مکمل طور پر تردید کردی ہے، جس طرح اُس نے زمین مرکزی (geo-centric) شمسی نظام کی تردید کردی تھی۔ اِس کے برعکس، سائنس کی دریافتیں پورے معنوں میں عقیدۂ توحید کے تحت بیان کردہ تصورِ خدا کی علمی تصدیق بن گئی ہیں۔

سائنس کی واپسی

ایک درخت جس کی جڑ کٹی ہوئی ہو، اس کو زمین میں لگائیں تو پہلے دن وہ بہ ظاہر ہرا بھرا دکھائی دے گا۔ مگر اگلے ہی دن اس کی پتیاں مرجھانا شروع ہوجائیں گی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر ختم ہوجائے گا۔ یہی حال موجودہ زمانے میں الحاد اور انکارِ مذہب کا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مذہب کا دور ختم ہو گیا، اور اب انسانی تاریخ ہمیشہ کے لیے لامذہبیت کے دور میں داخل ہوگئی۔ مگر جلد ہی یہ تمام خیالات بکھر گئے۔ مذہب نئی طاقت کے ساتھ دوبارہ انسانی زندگی میں لوٹ آیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں اس چیز کا زور تھا، جس کو علمی الحاد (scientific atheism) کہا جاتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں سائنس میں جو نئی تحقیقات ہوئیں، انھوں نے علمی الحاد کو بے زمین کرنا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سر جیمز جینز نے اعلان کیا تھا کہ جدید سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے، وہ مشینی توجیہہ (mechanical interpretation) کو قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اب اس صدی کے آخر میں نظریاتی طبیعیات دانوں (theoretical physicists) کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہوگئی ہے، جو کائنات کی تشریح ایسے انداز میں کر رہی ہے، جس کے مطابق، خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں 1988 میں ایک قابلِ ذکر کتاب چھپی ہے۔ یہ 200 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام حسب ذیل ہے:

Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time.*

بگ بینگ (Big Bang) نظریہ کہتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز سے اب تک ایک خاص رفتار سے مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس سلسلے میں اسٹیفن ہاکنگ نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کا یہ عمل نہایت سوچا سمجھا (well-calculated) ہے۔

توسیع (expansion) کی ابتدائی رفتار حد درجہ صحت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ کیوں کہ توسیع کی یہ رفتار اس نازک رفتار (critical rate) کے انتہائی قریب ہے، جو کائنات کو دوبارہ انہدام (recollapse) سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بگ بینگ کا

ماڈل درست ہے، اور اسی سے وقت کا آغاز ہوا ہے تو کائنات کی ابتدائی حالت حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک کائنات پھٹ کر ختم ہو چکی ہوتی۔

اس ظاہرے (phenomenon) کی کوئی توجیہہ (explanation) نہیں کی جا سکتی جب تک یہ نہ مانا جائے کہ کائنات کی توسیع کی شرح رفتار (rate of expansion) حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ نے اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کیوں ٹھیک اس انداز پر شروع ہوئی، اس کا جواب دینا انتہائی مشکل ہوگا، سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ یہ خدا کا عمل ہے، جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق کو یہاں پیدا کرے:

> It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us. (p. 134)

کائنات کی ایک حیرت ناک صفت یہ ہے کہ وہ خدائی تعبیر کے سوا کسی اور تعبیر کو قبول نہیں کرتی۔ کائنات ایک معلوم اور مشہور واقعہ ہے۔ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں بہترین دماغ اس کی تشریح و تعبیر میں مصروف رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کائنات ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے آپ بنی اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ کسی نے کہا کہ اسباب و علل (causes and effects) کا ایک سلسلہ ہے، جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو وجود دیا ہے۔ کسی نے اصولِ ارتقا کو کائنات کا خالق ثابت کرنے کی کوشش کی، وغیرہ۔ مگر خود انسانی معلومات ان تمام تشریحات و توجیہات کو رد کرتی ہیں۔ کائنات کے نظام کے بارے میں انسان جتنا زیادہ واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ یہ بات بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک خدائے ذوالجلال کے سوا کوئی اور ہو۔ کائنات اپنے وجود کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خدا ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کو کائنات کا خالق بتانا صرف ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت موجود نہیں۔ اس سلسلے میں جتنے دعوے یا مخالفانہ نظریے پیش کیے گئے، وہ خود علم انسانی کی روشنی میں غلط اور بے بنیاد ثابت ہو گئے۔

سائنس سے معرفت تک

انسان کی تخلیق کا مقصد قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (51:56)۔یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔لیعبدون کی تفسیر صحابی عبداللہ بن عباس (المجالسۃ وجواہر العلم للد ینوری، اثرنمبر225)، اور ان کے شاگرد مجاہد تابعی نے لیعرفون سے کی ہے (وقال مجاہد: إلا لیعبدون: لیعرفون) البحر المحیط، لأبی حیان الأندلسی، 9/562۔یعنی اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب ہے اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ابن جریج تابعی کے حوالے سے یہی بات نقل کی ہے۔قال ابن جریج: إلا لیعرفون (تفسیر ابن کثیر، 7/425)۔ابن جریج نے کہا: تاکہ وہ میری معرفت حاصل کریں۔اس معرفت کا تعلق انسان سے ہے۔

انسان ایک صاحبِ ارادہ مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔انسان کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے کہ انسان کے اندر تصوراتی سوچ (conceptual thinking) کی صلاحیت ہے۔انسان کے لیے معرفت کا تعین اسی بنیاد پر کیا جائے گا۔اس اعتبار سے انسان کے لیے معرفت کا معیار خود دریافت کردہ معرفت (self-discovered realization) ہے۔یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے سوچنے کی طاقت (thinking power) کو ڈیولپ کرے۔یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوجائے کہ وہ سیلف ڈسکوری کی سطح پر اپنے خالق کو دریافت کرلے۔

معرفت کے دو درجے

اس دریافت کے دو درجے ہیں۔پہلا درجہ ہے کامن سنس کی سطح پر اپنے خالق کو دریافت کرنا، اور دوسرا درجہ ہے سائنس کی سطح پر اپنے خالق کو دریافت کرنا۔پچھلے ہزاروں سال سے انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ اپنے کامن سنس کو بے آمیز انداز میں استعمال کرے۔وہ اپنی فطرت کو پوری طرح بیدار کرے۔اس طرح وہ اس قابل ہوجائے گا کہ وہ کامن سنس کی سطح پر اپنے خالق کی شعوری معرفت

حاصل کرلے۔ اس دریافت کی صرف ایک شرط تھی، اور وہ ہے ایمانداری (honesty)۔ اگر آدمی کامل ایمانداری کی سطح پر جینے والا ہو تو یقینی طور پر کامن سنس اس کے لیے اپنے خالق کی دریافت کے لیے کافی ہوجائے گی۔

معرفت کی دوسری سطح، سائنٹفک معرفت ہے۔ یعنی فطرت (nature) میں چھپی ہوئی آیات (signs) کو جاننا، اور ان کی مدد سے اپنے خالق کی عقلی معرفت (rational realization) تک پہنچنا۔ سائنٹفک معرفت کے لیے ضروری تھا کہ آدمی کے پاس غور وفکر کے لیے سائنس کا سپورٹنگ ڈیٹا موجود ہو۔ مجرد عقلی غور وفکر کے ذریعے سائنٹفک معرفت کا حصول ممکن نہیں۔ سائنٹفک معرفت تک پہنچنا کسی کے لیے صرف اس وقت ممکن ہے، جب کہ سائنس کا سپورٹنگ ڈیٹا موجود ہو۔ اس سائنٹفک ڈیٹا کے حصول کا واحد ذریعہ قوانینِ فطرت (laws of nature) کا علم ہے۔ قدیم زمانے میں انسان کو قوانینِ فطرت کا علم حاصل نہ تھا۔ اس لیے خالق کی سائنسی معرفت بھی انسان کے لیے ممکن نہ ہوسکی۔

خالق کی ایک سنت یہ ہے کہ وہ انسانی تاریخ کو مینج کرتا ہے، یعنی انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے انسان کو منصوبۂ تخلیق کے مطابق مطلوب حالت تک پہنچاتا ہے۔ خالق اپنا یہ کام انسانی آزادی کو منسوخ کیے بغیر انجام دیتا ہے۔ یہ ایک بے حد پیچیدہ کام ہے، اور اس کو خالق کائنات ہی اپنی برتر طاقت کے ذریعہ انجام دے سکتا ہے۔ ہمارا کام اس منصوبۂ خداوندی کو سمجھنا ہے، نہ کہ اس کے کورس کو بدلنے کی کوشش کرنا۔ کیوں کہ وہ ممکن ہی نہیں۔

قرآن کے ذریعے اللہ تعالی نے بار بار اہلِ ایمان کو یہ بتایا تھا کہ کائنات انسان کے لیے مسخر کردی گئی ہے۔ تم ان تسخیری قوانین کو دریافت کرو، تاکہ تم معرفت کے اس درجے تک پہنچ سکو، جس کو سائنسی معرفت کہا جاتا ہے۔ مگر اہلِ ایمان اس کام کو کرنے میں عاجز ثابت ہوئے۔ اس کے بعد اللہ نے اپنی سنت کے مطابق اس کام کے لیے ایک اور قوم کو کھڑا کیا (محمد، 47:38)۔ یہ یورپ کی مسیحی قوم تھی۔ ایسا اس طرح ہوا کہ صلیبی جنگوں (Crusades) میں یورپ کی مسیحی قوم کو اتنی سخت شکست

ہوئی کہ بہ ظاہران کے لیے جنگ کا آپشن (option) باقی نہ رہا۔ اب عملاً ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے معاملے کی ری پلاننگ کریں، اوراپنی کوشش کسی دوسرے میدان میں جاری رکھیں۔ چنانچہ انھوں نے میدانِ جنگ کے بجائے قوانینِ فطرت (laws of nature) کے دریافت کی طرف بتدریج اپنی کوششوں کارخ موڑ (divert) دیا۔

اٹلی کے سائنسداں گلیلیو گلیلی (وفات1642ء) کوفادر آف ماڈرن سائنس (father of modern science) کہاجاتاہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہی وہ پہلا سائنس داں تھا،جس سے ماڈرن سائنس کاسفر باقاعدہ صورت میں شروع ہوا۔ یہ عمل تقریباً چارسوسال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔ بیسویں صدی میں انسان کو وہ تمام سائنٹفک ڈیٹا حاصل ہوگئے، جوخالق کوسائنسی سطح یاریشنل لیول پردریافت کرنے کے لیےضروری تھے۔

اللہ نےجس عالم کوتخلیق کیا،اس کے ہر جزء پرخالق کی شہادت ثبت (stamped) ہے۔ پھر اس نے اس علم سے فرشتوں کو واقف کرایا۔ اس کے بعد اس نے اس حقیقت کو چھپے طور پر (hidden form) اس کائنات میں رکھ دی،جس کوانسان خودسےدریافت کرسکتا تھا۔ یہی وہ چھپی حقیقت ہےجودریافت کے بعدماڈرن سائنس کےنام سےجانی جاتی ہے۔

سائنس کی شہادت

سائنس کیاہے۔ سائنس دراصل ایک منظم علم کا نام ہے۔ سائنس سے مراد وہ علم ہےجس میں کائنات کامطالعہ موضوعی طورپرثابت شدہ اصولوں کی روشنی میں کیاجاتاہے :

> Science: the systematized knowledge of nature and the physical world.

کائنات کی حقیقت کے بارے میں انسان ہمیشہ غوروفکر کرتا رہاہے۔ سب سے پہلے روایتی عقائد کی روشنی میں، اس کے بعد فلسفیانہ طرزِفکر کی روشنی میں، اور پھر سائنس کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں۔ سائنس کا موضوع کائنات (physical world) کا مطالعہ ہے۔ تقریباً چارسو سال کے مطالعے کے ذریعے سائنس نے جودنیادریافت کی ہے، وہ استنباط (inference) کے اصول پرخالق

کے وجود کی گواہی دے رہی ہے۔لیکن قدیم زمانے میں غالباً کسی سائنسداں نے کھلے طور پر خدا کے وجود کا اقرار نہیں کیا ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ البرٹ آئن سٹائن (1879-1955) کی طرح ان کا کیس کھلے طور پر خدا کے انکار (atheism) کا کیس نہیں ہے، بلکہ ان کا کیس لاادری (agnosticism) کا کیس ہے۔

طبیعیاتی سائنس کے میدان میں پچھلی چار صدیوں میں تین انقلابی ڈیولپمنٹ پیش آئے ہیں۔ اول، برٹش سائنس داں نیوٹن کا مفروضہ کہ کائنات کی بنیادی تعمیری اینٹ مادہ ہے۔اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن سائنس داں آئن سٹائن کا یہ نظریہ سامنے آیا کہ کائنات کی تعمیری اینٹ توانائی ہے، اور اب آخر میں ہم امریکن سائنس داں ڈیوڈ بام کے نظریاتی دور میں ہیں، جب کہ سائنس دانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد یہ مان رہی ہے کہ کائنات کی بنیادی تعمیری اینٹ شعور ہے۔ یہ تبدیلیاں لازمی طور پر ایک نئے فلسفے کو جنم دیتی ہیں، جب کہ فلسفہ مادیت سے گزر کر عملاً روحانیت تک پہنچ گیا ہے:

> In the realm of the physical science, we have had three major paradigm shifts in the last four centuries. First, we had the Newtonian hypothesis that matter was the basic building block of the universe. In the early twentieth century, this gave way to the Einsteinian paradigm of energy being the basic building block. And the latest is the David Bohm era when more and more scientists are accepting consciousness to be the basic building block. These shifts have had inevitable consequences for the New Age philosophy, which has moved away from the philosophy of crass materialism to that of spirituality.

وہ دور جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے، اس کا آغاز تقریباً سو سال پہلے مغربی یورپ میں ہوا۔ دھیرے دھیرے عمومی طور پر یہ تاثر بن گیا کہ سائنس حقیقت کو جاننے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔ جو بات سائنس سے ثابت ہوجائے، وہی حقیقت ہے، جو بات سائنسی اصولوں کے ذریعے ثابت نہ ہو، وہ حقیقت بھی نہیں۔ابتدائی صدیوں میں سائنس خالص مادی علم کے ہم معنی بن گیا۔ چوں کہ مذہبی حقیقتیں

مادی معیارِ استدلال پر بہ ظاہر ثابت نہیں ہوتی تھیں، اس لیے مذہبی حقیقتوں کو غیر علمی قرار دے دیا گیا۔ لیکن علم کا دریا مسلسل آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب کہ خود سائنس مادی علم کے بجائے عملاً غیر مادی علم کے ہم معنی بن گیا۔

سائنس اور عقیدۂ خدا

پچھلی صدیوں کی علمی تاریخ بتاتی ہے کہ سائنس کے ارتقا کے ذریعے پہلی بار استدلال کی ایسی علمی بنیاد وجود میں آئی، جو عالمی طور پر مسلمہ علمی استدلال کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر اس میں مزید ارتقا ہوا، اور آخر کار سائنس ایک ایسا علم بن گیا جو مسلمہ عقلی بنیاد پر یہ ثابت کر رہا تھا کہ کائنات ایک بالاتر شعور کی کار فرمائی ہے۔ ایک سائنس داں نے کہا ہے — کائنات کا مادہ ایک ذہن ہے :

The stuff of the world is mind-stuff (Eddington)

1927 میں بلجیم کے ایک سائنس داں جارجز لیمٹری (Georges Lemaitre) نے بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ پیش کیا۔ اِس نظریے پر مزید تحقیق ہوتی رہی، یہاں تک کہ اِس کی حیثیت ایک مسلّمہ واقعہ کی ہوگئی۔ آخر کار 1965 میں بیگ گراؤنڈ ریڈی ایشن (background radiation) کی دریافت ہوئی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ کائنات کے بالائی خلا میں لہر دار سطح (ripples) پائی جاتی ہیں۔ یہ بگ بینگ کی شکل میں ہونے والے انفجار کی باقیات ہیں۔ اِن لہروں کو دیکھ کر ایک امریکی سائنس داں جویل پرائمیک (Joel Primack) نے کہا تھا— یہ لہریں خدا کے ہاتھ کی تحریر ہیں :

The ripples are no less than the handwriting of God
(www.newsweek.com/handwriting-god-198918 [accessed 23.03.2020])

جارج اسموٹ 1945 میں پیدا ہوا۔ وہ ایک امریکی سائنس داں ہے۔ اس نے 2006 میں فزکس کا نوبل پرائز حاصل کیا۔ یہ انعام اُن کو کاسمک بیک گراؤنڈ ایکسپلورر کے لیے کام کرنے پر دیا گیا۔ 1992 میں جارج اسموٹ نے یہ اعلان کیا کہ بالائی خلا میں لہر دار سطحیں پائی جاتی ہیں۔ یہ بگ

بینگ کی باقیات ہیں۔ اُس وقت جارج اسموٹ نے اپنا تاثر اِن الفاظ میں بیان کیا تھا— یہ خدا کے چہرے کو دیکھنے کے مانند ہے :

George Fitzgerald Smoot III (born February 20, 1945) is an American astrophysicist and cosmologist. He won the Nobel Prize in Physics in 2006 for his work on the Cosmic Background Explorer. In 1992 when George Smoot announced the discovery of ripples in the heat radiation still arriving from the Big Bang, he said it was "like seeing the face of God." (*God For The 21st Century*, Templeton Press, May 2000, p. 153)

فائن ٹیوننگ

اسی طرح سائنس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات کے مختلف اجزا آپس میں بے حد مربوط ہیں، اور ان کے درمیان ایک انتہائی فائن ٹیوننگ (fine-tuning) پائی جاتی ہے تو اِس مائنڈ باگلنگ (mind-boggling) ظاہرے کی کوئی توجیہہ ہونی چاہیے:

Fine-Tuning in the Universe:

"There is plenty of good scientific evidence that our universe began about 14 billion years ago, in a Big Bang of enormously high density and temperature, long before planets, stars and even atoms existed. But what came before[The physicist Lawrence] Krauss in his book discusses the current thinking of physicists that our entire universe could have emerged from a jitter in the amorphous haze of the subatomic world called the quantum foam, in which energy and matter can materialize out of nothing. Krauss's punch line is that we do not need God to create the universe. The quantum foam can do it quite nicely all on its own. Aczel asks the obvious question: But where did the quantum foam come from? Where did the quantum laws come from? Hasn't Krauss simply passed the buck? Legitimate questions. But ones we will probably never be able to answer." ...[The fine-tuning problem] For the past 50 years or so, physicists have become more and more aware that various fundamental parameters of our universe appear to be fine-tuned to allow the emergence of life —not only life as we know it but life

of any kind. For example, if the nuclear force were slightly stronger than it is, then all of the hydrogen atoms in the infant universe would have fused with other hydrogen atoms to make helium, and there would be no hydrogen left. No hydrogen means no water. On the other hand, if the nuclear force were substantially weaker than it is, then the complex atoms needed for biology could not hold together. In another, even more striking example, if the "cosmic dark energy" discovered by scientists 15 years ago, were a little denser than it actually is, our universe would have expanded so rapidly that matter could never have pulled itself together to form stars. And if the dark energy were a little smaller, the universe would have collapsed long before stars had time to form. Atoms are made in stars. Without stars there would be no atoms and no life. So, the question is: Why? Why do these parameters lie in the narrow range that allows life. (Book: 'Why Science Does Not Disprove God' by mathematician Amir D. Aczel, who is currently researcher in the history of science at Boston University. The above are excerpts taken from a review on the book by physicist Alan Lightman for The Washington Post, April 11, 2014)

تبصرہ

کوانٹم فزکس کے نظریے کو اگر اس معاملے پر منطبق کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے:

Probably, there is a God

یہ خالص سائنس کا موقف ہے۔ لیکن جہاں انسان کے وِجدان (intuition) کا تعلق ہے۔ اس کی سطح پر خدا کا وجود اتنا ہی یقینی ہے، جتنا کہ انسان کا وجود۔

جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک عظیم ذہن (mind) کی کار فرمائی ہے۔ کائنات کے اندر جو معنویت ہے، جو منصوبہ بندی ہے، جو بے نقص ڈزائن ہے، وہ حیرت انگیز طور پر ایک اعلیٰ ذہن کے وجود کو بتاتا ہے۔ کائنات میں ان گنت چیزیں ہیں۔ لیکن ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ کائنات میں حسابی درستگی اتنے زیادہ اعلیٰ معیار پر پائی جاتی ہے کہ ایک سائنس داں نے کہا کہ کائنات ایک ریاضیاتی ذہن (mathematical mind) کی موجودگی

کا اشارہ کرتی ہے۔

اس موضوع پر اب بہت زیادہ لٹریچر تیار ہو چکا ہے، جس کو انٹرنیٹ پر یا لائبریری میں دیکھا جاسکتا ہے۔ کائنات میں انٹلیجنٹ ڈیزائن ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارا سولر سسٹم جس میں ہماری زمین واقع ہے، وہ ایک بڑی کہکشاں (galaxy) کا ایک حصہ ہے۔ لیکن ہمارا شمسی نظام کہکشاں کے بیچ میں نہیں ہے، بلکہ اس کے کنارے واقع ہے۔ اس بنا پر ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم محفوظ طور پر زمین پر زندگی گزاریں، اور یہاں تہذیب (culture) کی تعمیر کریں:

> The centre of the galaxy is a very dangerous place. Being in the outskirts of the galaxy, we can live safely from the hectic activities at the centre.

اس حکیمانہ واقعہ کا اشارہ قرآن میں موجود تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنسی مطالعے کے ذریعے اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں، جو گویا قرآن کے اجمالی بیان کی تفسیر ہے۔ جب علم کا دریا یہاں تک پہنچ جائے تو اس کے بعد صرف یہ کام باقی رہ جاتا ہے کہ اس دریافت کردہ شعور یا اس ذہن کو مذہبی اصطلاح کے مطابق، خدا (God) کا نام دے دیا جائے۔

خدااورآخرت

تخلیق اپنے آپ میں خالق کا ثبوت ہے۔ کائنات اتنا زیادہ بامعنیٰ واقعہ ہے کہ یہ ناقابلِ تصور ہے کہ کسی کے بنائے بغیر وہ بن گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لیے انتخاب باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے، بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات یا غیر موجود کائنات میں ہے۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں خود کائنات کو غیر موجود ماننا پڑے گا، اور ہمارے لیے ایسا چانس (choice) سرے سے ممکن ہی نہیں۔

> The choice for us in this regard is not between universe with God or universe without God. This is not the choice. The real choice is between universe with God or no universe at all. If we say that God does not exist then we are also compelled to say that the universe does not exist. But the universe is too obvious a fact that we are not in a position to deny the existence of the universe. So we can not deny the existence of God.

بامعنیٰ کائنات

سر جیمس جنیز نے کہا تھا کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) ہے۔ میں کہوں گا کہ ہماری دنیا اتنی زیادہ بامعنیٰ ہے کہ وہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق معنویت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ ایسا خالق ایک ایسی دنیا کی تخلیق نہیں کرسکتا جو اپنے انجام کے اعتبار سے ناقص ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک بامعنیٰ خالق ایک بے معنیٰ کائنات کی تخلیق کرے۔ کائنات اپنی ساری معنویت کے باوجود اپنی موجودہ حالت میں ناقص ہے۔ وہ اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جس کو پیغمبروں نے آخرت کی دنیا کہا ہے۔

یہ آخرت کی دنیا صرف عقیدے کی بات نہیں۔ وہ پوری طرح ایک علمی واقعہ ہے۔ عالم

آخرت کے وجود کو ٹھیک اسی علمی معیار پر ثابت کیا جا سکتا ہے جس معیار پر سائنس میں دوسری تمام چیزوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

سائنسی ثبوت

اس معاملے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ سائنٹفک پروف کیا ہے۔ موجودہ سائنس کے مطابق، سائنٹفک پروف یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کے معاملے میں تیقن (certainty) کا درجہ حاصل ہو جائے۔ اس قسم کا ناقابلِ انکار تیقن کسی بھی چیز کے بارے میں ممکن نہیں۔ جدید سائنسی موقف کے مطابق، کسی چیز کا علمی طور پر ثابت ہو جانا یہ ہے کہ اس کا قرینہ یا امکان (probability) ثابت ہو جائے۔ جدید سائنس میں جن نظریات کو مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا ہے ان کو صرف اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ امکان (probability) کے درجے میں ثابت ہو گیا، نہ یہ کہ مشاہداتی سطح پر ان کے واقع ہونے کا قطعی علم حاصل ہو گیا ہے۔ ایٹم کے اسٹرکچر کو بطور حقیقت ماننا اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

عالم آخرت کے وجود کو ماننے کے لیے بھی ہمیں اسی مسلّمہ سائنٹفک متھڈ کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کسی دوسرے متھڈ کو استعمال کرنا اصولی طور پر درست نہیں۔ کیوں کہ علمی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ دوسرے معاملات میں جس سائنٹفک متھڈ کو ہم معقول (valid) مانیں، عالم آخرت کے بارے میں ہم اس متھڈ کے استعمال سے انکار کر دیں۔

تین علمی اصول

جیسا کہ معلوم ہے، اس طرح کے معاملے میں تین علمی اصول سائنٹفک متھڈ کے تین اجزاء ہیں۔ وہ اجزاء یہ ہیں — مفروضہ، مشاہدہ، اور تصدیق:

Hypothesis, Observation, Verification

اس تین نکاتی فارمولا کو عالم آخرت کے وجود کے معاملے میں استعمال کیا جائے تو ہم یقینی طور پر ایک موافق قرینہ یا ایک تائیدی امکان تک پہنچ جاتے ہیں، اور جیسا کہ عرض کیا گیا، قرینہ یا امکان تک پہنچنے ہی کا دوسرا نام تیقن (certainty) ہے۔

اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلا قرینہ یہ سامنے آتا ہے کہ انسان دوسری تمام مخلوقات سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی ایک استثنائی صفت ہے کہ وہ کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ انسان کے سوا جمادات اور نباتات اور حیوانات میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہو۔ اس مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے سوا دوسری تمام مخلوقات کی منزل صرف آج ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کی منزل آئندہ آنے والے کل (tomorrow) سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی جسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم ان گنت خلیوں (living cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لحہ ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم بار بار پرانے کے بعد نیا ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ بہتے ہوئے دریا کا پانی ہر وقت پرانا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی شخصیت اس کے جسم سے الگ ایک مستقل وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسم پر موت واقع ہوتی ہے، مگر اس کی روحانی شخصیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اندر نہایت گہری خواہشیں موجود ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان خواہشات کو طلب کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a desire-seeking animal.

مگر اسی کے ساتھ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی بھی انسان کی یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر انسان اپنی خواہشات کے مطابق اپنے لیے ایک معیاری دنیا بنانا چاہتا ہے مگر ہر انسان جلد ہی مر جاتا ہے، اس سے پہلے کہ اس نے اپنی خواہشوں کے مطابق اپنا مطلوب کل بنایا ہو۔

امید کی کرن

امریکی مشنری بلی گراہم نے لکھا ہے کہ اس کو ایک بار ایک بڑے امریکی سیاست داں کا ارجنٹ پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ مجھ سے فوراً ملو۔ بلی گراہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ فوراً سفر کرکے اس کے پاس پہنچا۔ بلی گراہم کا بیان ہے کہ جب میں اس کے گھر پہنچا تو فوراً مجھ کو اپنے شاندار مکان کے ایک الگ کمرہ میں لے جایا گیا۔ یہاں ہم دونوں دو کرسیوں پر آمنے سامنے

بیٹھ گئے۔ اس کے بعد امریکی سیاست داں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بلی گراہم سے کہا کہ دیکھو، میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی اپنی ساری معنویت کھوچکی ہے۔ میں نامعلوم کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان، کیا تم مجھے امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope. (The Secret of Happiness, by Billy Graham, p. 2)

یہ سوال صرف ایک امریکی سیاست داں کا سوال نہیں۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اس سوال سے دوچار ہوتا ہے، عورت بھی اور مرد بھی۔ اس سوال کا معقول جواب صرف عالم آخرت کے عقیدے میں ملتا ہے۔ اگر موت کے بعد ایک اور دنیا کو نہ مانا جائے تو یہ عالمگیر سوال ہمیشہ کے لیے بے جواب ہو کر رہ جائے گا۔

تضاد کا خاتمہ

انسان کے بارے میں اس قسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد پیدائشی طور پر دو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ ایک طرف ہر ایک کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایک مطلوب دنیا (dream world) بنائے، ایک ایسی دنیا جو اس کے آئیڈیل کے مطابق ہو اور جہاں وہ اپنے ''کل'' کے دور حیات کو خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ گزار سکے۔ مگر دوسری طرف ہر انسان اس تضاد میں مبتلا ہے کہ وہ بہ ظاہر تمام مادی چیزیں حاصل کر لینے کے باوجود اپنی مطلوب دنیا بنا نہیں پاتا۔ بورڈم، نقصان، بیماری، ایکسیڈنٹ، بوڑھاپا اور آخر میں سو سال سے بھی کم مدت میں موت، یہی اس دنیا میں انسان کی کہانی ہے۔

یہی معاملہ ہر عورت اور ہر مرد کا ہے۔ ہر ایک اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور بسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ہر ایک اپنی حسین تمناؤں کو لیے ہوئے مر جاتا ہے، قبل اس کے کہ اس نے اپنی مطلوب دنیا کو عملاً پایا ہو۔

یہاں دوبارہ ایک مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ دنیا میں عالمگیر طور پر زوجین (pairs) کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز دو کے ملنے سے مکمل ہوتی ہے —ایٹم میں نگیٹیو پارٹیکل اور پازیٹیو پارٹیکل، ستاروں کی دنیا میں جوڑا ستارے (pair stars)، نباتات کی دنیا میں نر اور مادہ، حیوانات کی دنیا میں مذکر اور مؤنث، انسان کی دنیا میں مرد اور عورت۔

اس عالمگیر فطری اصول کو زوجین کا اصول (pair principle) کہا جاسکتا ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔ اسی عالمگیر اصول میں مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ اس کے مطابق، ساری دنیا میں ایک جوڑا دنیا (pair world) ہے۔ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا موجود ہے، اور اسی دنیا کے ملنے سے ہی موجودہ دنیا اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

آغاز کی تکمیل

اب مذکورہ مشاہدے کی روشنی میں دیکھیے تو اس بات کی واضح تصدیق ہو جاتی ہے کہ عالم آخرت کا نظریہ درست ہے۔ عالم آخرت موجودہ دنیا کا جوڑا (pair) ہے، جس کے ملنے سے موجودہ دنیا اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ آخرت کے بغیر ہماری موجودہ دنیا اسی طرح بے معنی ہوجاتی ہے، جس طرح اس کائنات کی دوسری تمام چیزیں اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔

ہماری دنیا کا دو دنیاؤں کی صورت میں ہونا بہت بامعنٰی ہے۔ اس دوسری دنیا کو ماننے کے بعد انسانی وجود ایک مکمل وجود بن جاتا ہے۔ اب ہر چیز اپنی معنویت پالیتی ہے۔ اب ہر چیز اپنے خانے میں فٹ بیٹھ جاتی ہے:

Everything falls into place.

درست فریم ورک

یہ تصور ہم کو وہ فریم ورک دے دیتا ہے، جس میں زندگی اور کائنات کی ہر چیز اپنی اطمینان

بخشش توجیہہ پا سکے۔ اس تصور سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جنت اور جہنم کیا ہے۔ جنت گویا سنجیدہ اورحق پرست لوگوں کی آرام گاہ ہےاورجہنم گویا سرکش اور باطل پرستوں کا عذاب خانہ۔

اس کے مطابق جوتصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو عالم امتحان(testing ground) کے طور پر بنایا گیا ہے، اوراگلی دنیا کو اپنا انجام پانے کے لیے۔ انسان کو پیدائشی طور پر ابدی مخلوق کی حیثیت سے بنایا گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت عطا ہوئی ہے۔ تاہم انسان کی زندگی گویا آئس برگ کی مانند ہے، جس کا بہت چھوٹا حصہ اوپر دکھائی دیتا ہے، اوراس کا پورا بقیہ وجود سمندر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مدتِ عمر (life span) دوحصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا گیا ہے، اوراس کی مدتِ حیات کا زیادہ بڑا حصہ عالم آخرت میں رکھ دیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے تاکہ انسان اپنی شخصیت کو مکمل کرے۔ مثال کے طور پر موجودہ دنیا طرح طرح کی تلخیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انسان ان تجربات سے گزرتے ہوئے یہ ثبوت دے کہ وہ منفی حالات میں بھی مثبت احساسات کے ساتھ جی سکتا ہے۔ ایسے ہی مثبت شخصیات کے لوگ جنت کی معیاری دنیا میں داخل کیے جائیں گے۔ اس کے برعکس، جو لوگ ردِّعمل کا شکار ہوگئے، اور منفی تجربات کے درمیان خود بھی منفی بن گئے، ایسی منفی شخصیت رکھنے والے لوگوں کو جنت کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا۔ وہ کائناتی کوڑا خانے میں ڈال دیے جائیں گے، جہاں سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے۔

عضویاتی ارتقا کے نظریے کو موجودہ زمانے میں سائنٹفک فیکٹ سمجھا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ عضویاتی ارتقا کے نظریے کے حق میں مشاہداتی دلائل حاصل ہوگئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا کو ماننے کی صورت میں حیاتیاتی شواہد کی ایک قابلِ فہم توجیہہ حاصل ہوجاتی ہے۔ جب کہ علمائے سائنس کے نزدیک، دوسرا کوئی ایسا نظریہ موجود نہیں جو معلوم حیاتیاتی شواہد کی توجیہہ کرتا ہو۔ گویا نظریۂ ارتقا ایک قابل عمل نظریہ (workable theory) ہے، نہ کہ معروف

معنوں میں کوئی ثابت شدہ نظریہ (proved theory)۔

اطمینان بخش توجیہہ

اس سائنسی اصول کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں تمام معلوم شواہد کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں سب کچھ ناقابل توجیہہ بنا رہتا ہے۔

عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا ادھوری معلوم ہوتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات ناقابل فہم بنی رہتی ہے کہ بہت سے سچے اور اچھے انسان دنیا سے اس طرح چلے گئے کہ انھیں اپنی سچائی کا کوئی انعام نہیں ملا۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال پوری طرح ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا کا یہ واقعہ ناقابلِ توجیہہ بنا رہتا ہے کہ یہاں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ برائی اور سرکشی کرتے ہیں، مگر یہاں وہ اپنی برائی کی سزا نہیں پاتے۔ لیکن عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں ہم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔

اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات مکمل طور پر ناقابلِ فہم رہتی ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان یہاں ایک آئیڈیل ورلڈ کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے، مگر ہر شخص اس آئیڈیل ورلڈ کو پائے بغیر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال مکمل طور پر ختم ہوجاتا ہے۔ اب انسان اس یقین کے ساتھ موجودہ دنیا میں رہ سکتا ہے کہ جس مطلوب چیز کو وہ قبل ازموت دنیا میں نہ پاسکا، وہ اس کو بعد ازموت دنیا میں پالے گا۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز عبث پیدا نہیں کی گئی۔ سورج چاند کا نظام ہو یا زمین کے کیڑے مکوڑے سب ایک مقصد کے تحت پیدا کیے گئے ہیں، اور وہ اپنے اس مقصد کو پورا کررہے ہیں۔ اس حالت میں اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو بظاہر بلا مقصد معلوم ہوتی

ہے۔ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر حسین تمناؤں کا ایک تصور بسا ہوا ہے، کوئی بھی عورت یا مرد اس سے خالی نہیں۔ پھر جب اس دنیا کی دوسری تمام چیزیں واضح مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بھی اپنی ایک حقیقی منزل رکھتی ہوں۔ جس کائنات میں ہر چیز بامقصد ہو، وہاں انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بے مقصد نہیں ہوسکتیں۔

یقینی طور پر یہ خواہشیں اور تمنائیں بھی سوچی سمجھی تخلیق ہیں۔ ان کی پیدائش کا ایک واضح مقصد ہے۔ البتہ یہ مقصد موجودہ محدود دنیا میں پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ خواہشیں اور تمنائیں لامحدود ہیں، اور وہ ایک لامحدود دنیا ہی میں پوری ہوسکتی ہیں۔ اسی لامحدود دنیا کا نام آخرت ہے۔

آخرت کی اس لامحدود دنیا میں اچھے لوگوں کو ابدی جنت ملے گی، جو ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ اس کے برعکس جو لوگ موجودہ دنیا میں برے ثابت ہوں، ان کو آخرت کی دنیا میں کائناتی کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا، جہاں وہ مجبور ہوں گے کہ وہ اپنی برائیوں کی سزا ابدی طور پر بھگتتے رہیں۔

جنت کی حقیقت

جنت کیا ہے۔ جنت انسان کی تلاش کا جواب ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جہاں وہ ایک انوکھے استثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔ وسیع کائنات کا ہر جزء اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو اپنے آپ میں مکمل نہیں۔ پوری کائنات ایک بے نقص (zero-defect) کائنات ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر ناقص وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔

کائنات میں ہر طرف یقین (certainty) ہے۔ اس کے برعکس، انسان کی دنیا میں غیر یقینیت (uncertainty) عام ہے۔ بقیہ کائنات میں کہیں خوف (fear) دکھائی نہیں دیتا، مگر انسان ہمیشہ خوف اور اندیشے سے دوچار رہتا ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر طرف تسکین (satisfaction) کی حالت ہے، اور انسان کی زندگی میں بے تسکینی (dissatisfaction) کی حالت ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر چیز کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اس کو چاہیے، وہ سب اس کو مل رہا ہے، مگر انسان اس دنیا

کی واحد مخلوق ہے، جو اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا، وہ اس کو نہیں ملا۔ بقیہ کائنات بُرائی سے پاک (evil-free) کائنات ہے۔ مگر انسان استثنائی طور پر اس مسئلے سے دوچار ہے، جس کو برائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

جنت اسی سوال کا جواب ہے۔ جنت کا تصور بتاتا ہے کہ انسان کے لیے بھی وہ سب کچھ پوری طرح موجود ہے، جو بقیہ کائنات کو ملا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات کو اپنا مطلوب آج میں مل رہا ہے، جب کہ انسان کو اس کا مطلوب کل میں ملے گا۔ دونوں کے معاملات کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایسا ہے کہ بقیہ کائنات کے پاس کل (tomorrow) کا تصور نہیں۔ یہ صرف انسان ہے، جو استثنائی طور پر کل کے تصور میں جیتا ہے۔

فطرت کا حصہ

خدا اور آخرت کا معاملہ بظاہر غیر مشہود دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت خدا اور آخرت کے معاملے کو ایک معلوم صداقت کے طور پر جان لیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی معرفت کے دو درجے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فطری۔ خدا اور آخرت کے وجود کو عقلی سطح پر ماننا، اس معرفت کا صرف ابتدائی درجہ ہے۔ جب کہ خدا اور آخرت کے وجود پر فطری سطح پر یقین کرنا، اس کا انتہائی درجہ۔ خدا اور آخرت کے معاملے میں عقلی دلائل کے استعمال کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر سے شک کے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ انسان کو اس مقام تک لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے معاملے کو کم از کم امکانی صداقت کے طور پر قبول کر لے۔

خدا اور آخرت کے معاملے میں دلیل اور منطق کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس فکری سطح پر لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے وجود کو بطور ایک نظریہ ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔ جب آدمی اس حالت تک پہنچ جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس نظریہ کو قبول کرنے کے لیے اس کی فطرت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ اس کو ایک فطری سچائی کے طور پر پہچان کر اپنا لے۔

ہر انسان کے پاس وہ آنکھ موجود ہے، جو خدا اور آخرت کو دیکھ سکے، مگر اس آنکھ کے اوپر کنڈیشننگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منطقی دلیل یہ کام کرتی ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ یا اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑ کر اس مصنوعی پردہ کو فطرت کی آنکھ سے ہٹا دے۔ اس کے بعد انسان خدا اور آخرت کو صاف دیکھنے لگتا ہے۔ اب انسان بہ ظاہر نہ دکھائی دینے والے خدا کے وجود پر اسی طرح کامل یقین کر لیتا ہے، جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خدا اور آخرت کا معاملہ صرف اس وقت تک منطقی بحث کا موضوع رہتا ہے، جب تک کہ آدمی کے ذہن کا مصنوعی پردہ ہٹا نہ ہو۔ غور وفکر یا منطقی استدلال کے ذریعے جب یہ پردہ ہٹ جائے تو انسان اپنے خدا کو خود اپنی داخلی معرفت کے تحت پہچان لیتا ہے۔ اب خدا اس کے لیے تمام معلوم چیزوں سے زیادہ معلوم واقعہ بن جاتا ہے۔ منطقی دلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے دروازے تک پہنچا دے۔ فطرت کا دروازہ کھلتے ہی انسان خدا کو اس طرح پا لیتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔

انسان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو ضرورت ہوتی ہے کہ سورج کے وجود کو اس کے لیے دلائل سے ثابت کیا جائے۔ لیکن جب آنکھ کی پٹی ہٹا دی جائے تو اس کے بعد سورج کو ماننے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں آخری حد تک سمایا ہوا ہے۔ اصل ضرورت صرف فطرت کا پردہ ہٹانے کی ہے۔ دلیل کے ذریعے جب فطرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان خدا کو اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے، جتنا کہ ایک کھلی آنکھ والا انسان آفتاب کو۔

جدید سائنس

رابرٹ بائل (Robert Boyle) مشہور سائنس داں ہے۔ وہ 1627 میں پیدا ہوا، اور 1691 میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سائنس کے مطالعے کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر سائنس کے مطالعے نے اس کو مذہب سے دور نہیں کیا، بلکہ اور قریب کر دیا۔ آخر میں وہ پختہ قسم کا پروٹسٹنٹ عیسائی بن گیا۔ اس نے شادی نہیں کی، اور اپنی تمام کمائی مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

رابرٹ بائل خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق، فطرت کا نظام ایک گھڑی کی مانند ہے۔ خدا نے اس کو پیدا کیا اور اس کو ابتدائی طور پر چلا دیا۔ اب وہ ثانوی قانون کے تحت عمل کر رہی ہے۔ جس کا سائنس کے ذریعے مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

> In his view of divine providence, nature was a clocklike mechanism that had been made and set in motion by the Creator at the beginning and now functioned according to secondary laws, which could be studied by science (3/97).

یہ بیسویں صدی سے پہلے کی سائنس تھی۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں یکسانیت (uniformity) ہے۔ کائنات کے تمام اجزاء یکساں قوانین کے تحت چل رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں پہنچ کر یہ نظریہ باقی نہ رہ سکا۔ کائنات کبیر (macrocosm) کے مطالعے میں بہ ظاہر یہ دکھائی دیا تھا کہ کائنات میں یکسانیت کی کارفرمائی ہے۔ مگر کائنات صغیر (microcosm) کے مطالعے نے اس مفروضہ کو رد کر دیا۔ شمسی نظام کی سطح پر انسان کو جو یکسانیت نظر آتی تھی، وہ ایٹم کی سطح پر پہنچ کر ٹوٹ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کو خدا ہی نے اپنے حکم سے بنایا ہے، اور وہی اپنے حکم سے اس کو چلا رہا ہے۔ نہ کائنات کو بنانے میں کوئی اس کا شریک ہے، اور نہ کائنات کو چلانے میں کوئی اس کا شریک۔ ایک خدا کو چھوڑ کر جو نظریہ بھی کائنات کی توجیہہ کے لیے بنایا جاتا ہے، وہ بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک خدا کی توجیہہ ہی صحیح توجیہہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری توجیہہ صرف انسان کا ذہنی مفروضہ ہے، اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔

وحی والہام

قرآن کی سورہ النحل میں ہے: وَأَوۡحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحۡلِ (16:68)۔ یعنی اللہ نے شہد کی مکھی کو وحی کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں میں بعض ایسی نشانیاں ہیں جو وحی سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وحیِ الٰہی کے معاملے کو انسان کے لیے قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔

وحی کے عقیدے کا مطلب خارجی ذریعۂ علم سے رہنمائی کا آنا ہے۔ جانور کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے درمیان اس قسم کا ذریعۂ علم واضح طور پر موجود ہے۔ جانوروں میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں، جن کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جاسکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو اپنے باہر سے ہدایات مل رہی ہیں۔ انھیں صفات میں سے ایک صفت جانوروں کی مہاجرت (migration) کا معاملہ ہے۔ خاص طور پر مچھلیوں اور چڑیوں کی مہاجرت اپنے اندر ایسی نشانیاں رکھتی ہے جس کے بعد وحی والہام کے معاملے کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا۔

یہاں ہم مہاجر چڑیوں (migratory birds) کا حوالہ دیں گے۔ بہت سی چڑیاں ہیں جو خوراک کی تلاش میں یا موسم کی تبدیلی کی بنا پر ایسا کرتی ہیں کہ خاص خاص وقتوں میں اپنے اصل مقام سے ہجرت کر کے دوسرے موزوں تر مقامات پر جاتی ہیں، اور پھر ایک خاص مدت کے بعد دوبارہ اپنے سابق مقام پر واپس آجاتی ہیں۔

ان پروازوں کے بارے میں موجودہ زمانے میں نہایت وسیع مشاہدات کیے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں بے مقصد اڑان کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ایک ماہرِ طیور کے الفاظ میں ان کی حیثیت نہایت اعلیٰ درجے کے جغرافی بندوبست (geographical arrangement) کی ہے۔ وہ اتنا ہی بامعنی ہیں، جتنا کسی انسان کا سوچا سمجھا ہوا سفر بامعنی ہوتا ہے۔ نیز مشاہدات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں انتہائی صحیح طور پر مقرر راستوں (well-defined flyways) پر انجام پاتی ہیں۔

چڑیوں کا یہ سفر نہایت عجیب ہے۔ انسان کے لیے صحیح طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا اسی وقت ممکن ہوتا ہے، جب کہ اس نے راستہ اور منزل کی پوری معلومات خارج سے حاصل کر لی ہوں۔ یہ ''خارجی ذریعہ'' انسان کے لیے دوسروں سے سننا یا دوسروں کی تحقیق کو پڑھنا یا خود بیرونی احوال کا تجربہ کرنا ہے۔ اگر انسان کو تاریخی طور پر جمع شدہ معلومات سے، آپس کے تبادلہ خیال سے، یا تعلیم گاہوں کی تعلیم سے کاٹ دیا جائے تو انسان کچھ نہ کر سکے۔

مثال کے طور پر الادریسی (ابوعبداللہ محمد بن محمد الادریسی [1100-1166ء]) نے زمین کے گول ہونے کا ابتدائی تصور ہندی نظریہ عرین (Arin) سے لیا۔ پھر الادریسی کی کتاب کے لاطینی ترجمے سے یہ فکر کولمبس تک پہنچی۔ پھر کولمبس (Christopher Columbus [1451-1506]) کے تجربات سے بعد والوں کے علم میں اضافہ ہوا۔ یہ سلسلہ ایک کے بعد ایک اسی طرح بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جغرافیہ کا علم ترقی کے اس درجے تک پہنچا، جو آج کے انسان کو حاصل ہے۔ آج جب سمندری جہاز کا ایک کپتان وسیع سمندر میں داخل ہو کر اس ساحل سے اُس ساحل تک اپنا جہاز لے جاتا ہے۔ یا ہوائی جہاز کا پائلٹ ایک براعظم سے اڑ کر دوسرے براعظم میں اترتا ہے تو اس عمل کے پیچھے سیکڑوں سال کے انسانی تجربات کا علم شامل ہوتا ہے۔

چڑیاں اس طرح کا کوئی ذریعۂ علم نہیں رکھتیں۔ وہ اس قسم کے ذریعے معلومات سے مکمل طور پر کٹی ہوئی ہیں۔ چڑیوں کے اندر باہم تبادلۂ خیال نہیں ہوتا، جس طرح انسانوں کے اندر ہوتا ہے۔ اس بنا پر چڑیوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک چڑیا دوسری چڑیا کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنی معلومات کو بڑھائے۔ کوئی چڑیا اپنی معلومات کو کتاب کی صورت میں قلم بند نہیں کرتی کہ دوسری چڑیا اس کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس قسم کی ہر سہولت سے کامل محرومی کے باوجود یہ چڑیاں بالکل انسانوں کی مانند سفر کرتی ہیں۔ وہ اس درجۂ صحت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی ہیں، جیسے کہ ریڈیائی کنٹرول کے ذریعے کوئی راکٹ خلا میں چلایا جا رہا ہو۔

مہاجر چڑیوں کا مطالعہ کرنے والے ایک محقق نے لکھا ہے کہ چڑیوں کی ہجرت کی پروازیں

متعین راستوں پر ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لمبے فاصلوں پر حددرجہ عمدہ تعین کے ساتھ:

The migration flights of birds follows specific routes, sometimes quite well defined over long distances (Encylopædia Britannica "migration" 12/181).

افریقہ میں چڑیوں کی مہاجرت کا جو انداز ہے، اس میں انوکھی ڈسپلن پائی جاتی ہے۔ مثلاً بعض چڑیاں جو ایک مخصوص حلقے میں گھونسلہ بناتی ہیں، جو خط استواء (equator) پر مغرب میں سینیگال اور مشرق میں کینیا تک پھیلا ہوا ہے، وہ خاص وقتوں میں شمال کی طرف ہجرت کر جاتی ہیں۔ تا کہ وہ بارش کے موسم سے بچ سکیں:

The Migratory behaviour of birds has a unique regularity in Africa. The standard-wing jar, which nests in a belt extending from Senegal in the west to Kenya in the east along the equational forest, migrates northward to avoid the wet season (Encylopædia Britannica "migration" 12/180)

اس مضمون کے آخر میں نقشہ دیا گیا ہے۔ یہ نقشہ چڑیوں کے بین براعظمی سفر کو بتا رہا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ روس اور دوسرے یورپی علاقوں کی چڑیاں کس طرح سرد موسم میں اپنے علاقے سے نکل کر افریقہ اور ایشیا کے گرم علاقوں کی طرف جاتی ہیں۔ اس لمبے سفر میں انھیں تین سمندروں سے واسطہ پیش آتا ہے — انھیں کیسپین سمندر (Caspian Sea) اور بحر اسود (Black Sea) اور بحر متوسط (MediterraneanSea) کو پار کرنا پڑتا ہے۔ یہ چڑیاں ایسا نہیں کرتیں کہ بے خبری کے عالم میں بس اپنے مقام سے اڑ کر کسی طرف بھی روانہ ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ نہایت صحت کے ساتھ اس رخ کا تعین کرتی ہیں، جو ان کے لیے موزوں ترین ہے۔ وہ نہایت صحت کے ساتھ عین وہ راستے اختیار کرتی ہیں، جدھر سے جانے میں انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر سے گزرنا پڑے۔ کیوں کہ خشکی پر بوقت ضرورت نیچے اتر سکتی ہیں، مگر سمندر میں اترنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

اس نقشے کو دائیں سے بائیں کی طرف دیکھیے۔ اس میں چڑیوں کا پہلا جھنڈ وہ ہے، جو

یورپ سے آتے ہوئے وہاں پہنچتا ہے، جہاں ان کی راہ میں بحر کیسپین حائل ہے۔ یہاں وہ مڑ جاتی ہیں وہ بحر کیسپین کو کنارے چھوڑتے ہوئے ایک طرف قراقرم کی جانب سے اور دوسری طرف کاکیشیا کی جانب سے پرواز کرکے ایشیا میں داخل ہوتی ہیں، اور اپنے مطلوبہ مقامات پر اتر جاتی ہیں۔

یہ چڑیاں ٹھیک یہی معاملہ بحرِ اسود کے ساتھ بھی کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کا جھنڈ یہاں پہنچ کر دو ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ ان کا ایک حصہ بحر اسود کے مغربی ساحل سے اور دوسرا حصہ مشرقی ساحل سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایشیائی علاقے میں داخل ہوجاتا ہے۔ ایک ماہرِ طیور (Ornithologist) نے لکھا ہے کہ یہ بخوبی طور پر الگ الگ راستے غالباً چڑیوں نے اس لیے اختیار کیے ہیں کہ وہ سمندر کے اوپر لمبی پرواز سے بچ سکیں:

These well-separated routes are probably a result of the stork's aversion to long flights over water (Encylopædia Britannica "migration" 12/180)

اس کے بعد چڑیوں کے تیسرے جھنڈ کا منظر ہے۔ یہ چڑیاں بلغاریہ تک آکر ترکی کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ پھر شام، لبنان اور فلسطین کے ساحلی علاقوں میں سفر کرتے ہوئے وہ سوئز تک پہنچتی ہیں۔ یہاں سے وہ مصر کی سرزمین میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آگے افریقی علاقوں میں چلی جاتی ہیں۔

چڑیوں کا چوتھا جھنڈ یونان کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جس کی خشکی لمبی نوک کی مانند بہت دور تک سمندر کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ چڑیاں یونان اور کریٹ کی خشکی کا سہارا لیتے ہوئے سمندر میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سمندر کا وہ مقام ہے جو سب سے کم چوڑا ہے۔ وہ اپنے طویل سفر میں سمندر کو عین اس نقطے پر عبور کرتی ہیں، جہاں جغرافی طور پر اس کی چوڑائی سب سے کم ہوجاتی ہے۔ چڑیاں اس راستے کو واضح طور پر اس لیے اختیار کرتی ہیں کہ انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر پرواز کرنا پڑے۔ یعنی عین وہی وجہ جس کی بنا پر قدیم زمانے میں انسانی قافلے بیچ سمندر میں اپنی کشتی ڈالنے کے بجائے

"آبنائے" کے مقام پر سمندروں کو عبور کیا کرتے تھے۔

چڑیوں کا پانچواں جھنڈ وہ ہے، جو آگے بڑھ کر اٹلی کے راستے پر مڑ جاتا ہے۔ وہ اٹلی کے اوپر پرواز کرتے ہوئے سسلی میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دائیں اور بائیں سمندر کو چھوڑتا ہوا لمبا راستہ خشکی کے اوپر اوپر طے کرتا ہے، اور پھر سسلی کے ساحل سے سمندر میں داخل ہو کر افریقہ میں پہنچ جاتا ہے، دوبارہ عین اسی مقام پر جہاں سمندر کی چوڑائی سب سے کم تھی۔

چڑیوں کا چھٹا جھنڈ اس نقشے میں فرانس کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور پھر وہ اسپین کی طرف مڑ کر خشکی کے اوپر اڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جبرالٹر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وسیع سمندر صرف دس میل چوڑا رہ جاتا ہے۔ یہ چڑیاں سمندر کو عبور کرنے کے لیے اس موزوں ترین مقام کا انتخاب کرتی ہیں۔ وہ یہاں پہنچ کر سمندر میں داخل ہوتی ہیں، اور آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے افریقہ کی زمین پر اتر جاتی ہیں۔

چڑیوں کے یہ اسفار انتہائی حد تک حیرت انگیز ہیں۔ آج کا ایک انسان جب اس قسم کا طویل سفر کرتا ہے تو وہ بہت سے علوم سے مدد لیتا ہے۔ مگر چڑیوں کے اندر نہ انسانی ذہن ہے اور نہ علوم سے مدد لینے کا انتظام۔ پھر چڑیاں کیوں کر اس قسم کے پیچیدہ اسفار میں کامیاب ہوتی ہیں، ایک ماہر طیور نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے:

> Birds have evolved a highly efficient means for travelling swiftly over long distances with great economy of energy (Encylopædia Britannica "migration" 12/179).

چڑیوں نے نہایت اعلیٰ درجے کے ارتقا یافتہ موثر ذریعے دریافت کر لیے ہیں تا کہ وہ لمبے فاصلوں پر کم سے کم طاقت خرچ کر کے بخوبی سفر کر سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چڑیوں کے اندر یا ان کے حالات میں ہرگز ایسے شواہد موجود نہیں ہیں جو یہ ثابت کریں کہ چڑیوں نے کسی ارتقائی عمل کے ذریعے یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی ہے۔

گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو اس معاملے کی توجیہہ کے لیے دو ہی ممکن مفروضے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان چڑیوں کو یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے جغرافیہ کا اور اس کی خشکی اور تری کا مکمل علم حاصل

ہو۔مگر کوئی بھی تحقیق ایسا ثابت نہیں کرتی۔ ہماری تمام معلومات کے مطابق چڑیاں بذاتِ خود کسی بھی قسم کے جغرافی علم سے قطعاً نابلد ہیں۔ اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ محض بے بنیاد قیاس ہے، جس کے حق میں کوئی علمی شہادت موجود نہیں۔

اس کے بعد دوسرا ممکن مفروضہ صرف یہ ہے کہ کوئی ''واقفِ جغرافیہ'' ان کی رہنمائی کر رہا ہو۔ یہاں کوئی مخفی قسم کا ریموٹ کنٹرول ہو، جو چڑیوں کو ٹھیک اسی طرح مسلسل رہنمائی دے رہا ہو، جیسے ہمارے غیر انسان بردار راکٹ کو ریڈیائی کنٹرول کے ذریعے دور سے رہنمائی دی جاتی ہے۔ یہی دوسری صورت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اس عقیدے کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دیتا ہے، جس کو آسمانی مذہب میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جانوروں کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو ایک خارجی خزانۂ علم سے رہنمائی مل رہی ہے۔ اسی کا نام مذہبی زبان میں وحی ہے۔ جانوروں کی زندگی کا مطالعہ وحی کے معاملہ کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے، اور قرائن کے ذریعے کسی چیز کا قابلِ فہم ہونا ہی کافی ہے کہ اس کی واقعیت وصداقت پر یقین کیا جائے۔

وحی کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے مخفی ذریعے سے ایک انسان پر اپنی رہنمائی بھیجتا ہے۔ یہ رہنمائی بتاتی ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ خدا اور بندہ (پیغمبر) کے درمیان وحی کا یہ اتصال بہ ظاہر دکھائی نہیں دیتا، اس لیے کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم کیوں کر اسے مانیں۔

مگر دوسری مخلوقات، مثلاً مہاجر چڑیوں کے سفر کے معاملے پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ''وحی'' کی نوعیت کی رہنمائی موجود ہے۔ ان چڑیوں کا حد درجہ صحت کے ساتھ سفر کرنا ایک ایسا واقعہ ہے، جو وحی کے معاملے کو ہمارے لیے قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ چڑیوں کے ان اسفار کی کوئی بھی حقیقی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو خارج سے کوئی مخفی قسم کی رہنمائی مل رہی ہے۔ جب چڑیوں کے اپنے اندر اس کے معلوم اسباب موجود نہیں ہیں تو اس کے سوا

اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کو خارج سے آنے والی چیز قرار دیا جائے۔

پیغمبر کا یہ دعوی کہ اس کو خدا کی طرف سے مخفی رہنمائی آتی ہے، بلا شبہ عجیب ہے۔ مگر اس قسم کی مخفی رہنمائی موجودہ کائنات میں عجیب نہیں۔ یہاں دوسرے ایسے واقعات کثرت سے موجود ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس قسم کی رہنمائی کائنات میں بطور واقعہ موجود ہے۔ مہاجر چڑیوں کا معاملہ ان بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال ہے، جس کو نہایت مختصر طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔



علم کا سفر

قرآن خدا کی کتاب کی حیثیت سے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اترا۔ اس وقت ساری دنیا میں توہم پرستی کا کلچر رائج تھا۔ قرآن کے بعد علمی دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ دور بیسویں صدی عیسوی میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔ قرآن کی صداقت کا یہ علمی ثبوت ہے کہ بعد کی علمی تحقیقات قرآن کی باتوں کی تصدیق بنتی چلی گئیں۔ اس سلسلے میں برٹش سائنسداں سرجیمس جینز کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> The stream of knowledge is heading towards a non-mechanical reality; the universe begins to look more like a great thought than like a great machine. (*The Mysterious Universe,* James Jeans, p. 137)

یہ بات برٹش سائنسداں نے 1930 میں کہی تھی۔ اس کے بعد کی تمام دریافتیں اس بات کی تصدیق بنتی چلی گئیں کہ حقیقت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے، وہی درست تصور ہے۔ اس درمیان سائنسی دریافتوں کے ذریعے ملحدانہ تصورات رد ہوتے چلے گئے، اور موحدانہ تصورات ثابت شدہ بنتے چلے گئے۔

مثلاً قدیم ملحدین یہ سمجھتے تھے کہ کائنات ابدی ہے، وہ جیسی آج ہے، ویسی ہی وہ ابد سے چلی آرہی ہے، اس لیے کائنات کو خالق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر بعد کی سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے۔ 13 بلین سال پہلے بگ بینگ (Big Bang) کی صورت میں کائنات کا آغاز ہوا۔ اسی طرح قدیم ملحدین مانتے تھے کہ کائنات میں کوئی نظم نہیں، مگر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ کائنات میں ایک ذہین ڈیزائن (intelligent design) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی تمام دریافتیں مذہبِ توحید کی تصدیق کرتی ہیں، خواہ براہِ راست طور پر ہوں، یا بالواسطہ طور پر۔

سائنس توحید کی طرف

علم طبیعیات میں، نیوٹن کے بعد سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چار قسم کے قوانین یا طاقتیں ہیں، جو فطرت کے مختلف مظاہر کو کنٹرول کرتی ہیں:

1۔قوت کشش(Gravitational Force)

2۔برقی مقناطیسی قوت(Electromagnetic Force)

3۔طاقت ور نیوکلیر قوت(Strong Nuclear Force)

4۔کمزور نیوکلیر قوت(Weak Nuclear Force)۔

کشش کا قانون، ایک کہانی کے مطابق، نیوٹن نے اس وقت معلوم کیا جب کہ اس نے سیب کے درخت سے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا۔ ''سیب اوپر کی طرف کیوں نہیں گیا، نیچے زمین پر کیوں آیا۔'' اس سوال نے اس کو اس جواب تک پہنچایا کہ زمین میں، اور اسی طرح تمام دوسرے کروں میں، جذب وکشش کی قوت کار فرما ہے۔ بعد کو آئن سٹائن نے اس نظریے میں بعض فنی اصلاحات کیں۔ تاہم اصل نظریہ اب بھی سائنس میں ایک مسلّمہ اصولِ فطرت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ برقی مقناطیسی قانون کا تجربہ پہلی بار فریڈے ([1791-1867] Michael Faraday) نے 1831 میں کیا۔ اس نے دکھایا کہ بجلی کی قوت اور مقناطیس کی قوت ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مقناطیس اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو بجلی پیدا ہو جاتی ہے، اور مقناطیس اور بجلی کی لہر کو یکجا کریں تو حرکت وجود میں آجاتی ہے۔

ابتدائی 50 سال تک تمام طبیعی واقعات کی توجیہہ کے لیے مذکورہ دو قوانین کافی سمجھے جاتے تھے۔ مگر موجودہ صدی کے آغاز میں جب ایٹم کے اندرونی ڈھانچے کی بابت معلومات میں اضافہ ہوا، اور یہ معلوم ہوا کہ ایٹم سے بھی چھوٹے ذرات ہیں جو ایٹم کے اندر کام کر رہے ہیں تو طبیعی نظریات میں تبدیلی شروع ہوگئی۔ یہیں سے طاقت ور نیوکلیر فورس اور کمزور نیوکلیر فورس کے نظریات

پیدا ہوئے۔ ایٹم کا اندرونی مرکز (نیوکلیس) الکٹران سے گھرا ہوا ہے، جو کہ پروٹان نامی ذرات سے بہت زیادہ چھوٹے اور ہلکے ہیں۔ مگر مطالعہ بتاتا کہ ہر الکٹران وہی چارج رکھتا ہے، جو بھاری پروٹان رکھتے ہیں۔ البتہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ الکٹران میں منفی برقی چارج ہوتا ہے، اور پروٹان میں مثبت برقی چارج۔ الکٹران ایٹم کے بیرونی سمت میں اس طرح گردش کرتے ہیں کہ ان کے اور ایٹم کے مرکز (نیوکلیس) کے درمیان بہت زیادہ خلا ہوتا ہے۔ مگر منفی چارج اور مثبت چارج دونوں میں برابر برابر ہوتے ہیں، اور اس بنا پر ایٹم بحیثیت مجموعی برقی اعتبار سے نیوٹرل (neutral) اور قائم (stable) رہتا ہے۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایٹم کا مرکز بطور خود قائم (stable) کیوں کر رہتا ہے۔ الکٹران اور پروٹان الگ الگ ہو کر بکھر کیوں نہیں جاتے۔ قائم رہنے (stability) کی توجیہہ طبیعیاتی طور پر یہ کی گئی ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے قریب ایک نئی قسم کی طاقتور قوتِ کشش موجود ہوتی ہے۔ یہ قوت ایک قسم کے ذرات سے نکلتی ہے جن کو میسن (Mesons) کہا جاتا ہے۔ ایٹم کے اندر پروٹان اور نیوٹران کے ذرات بنیادی طور پر یکساں (identical) سمجھے جاتے ہیں۔ مقناطیس کے دو ٹکڑوں کو لیں اور دونوں کے یکساں رخ (ساؤتھ پول کو ساؤتھ پول سے یا نارتھ پول کو نارتھ پول سے) ملائیں تو وہ ایک دوسرے کو دور پھینکیں گے۔ اس معروف طبیعی اصول کے مطابق پروٹان اور نیوٹران کو ایک دوسرے سے بھاگنا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پروٹان اور نیوٹران ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں، اور اس بدلنے کے دوران میسن کی صورت میں قوت خارج کرتے ہیں، جو ان کو جوڑتی ہے۔ اسی کا نام طاقت ور نیوکلیر فورس ہے۔ اسی طرح سائنس دانوں نے دیکھا کہ بعض ایٹم کے کچھ ذرات (نیوٹران میسن) اچانک ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال مثلاً ریڈیم میں پیش آتی ہے۔ ایٹم کے ذرات کا اس طرح اچانک ٹوٹنا طبیعیات کے مسلّمہ اصولِ تعلیل (causality) کے خلاف ہے۔ کیوں کہ پیشگی طور پر یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ایٹم کے متعدد ذرات میں سے کون سا ذرہ پہلے ٹوٹے گا۔ اس کا مدار تمام تر اتفاق پر ہے۔ اس مظہر کی توجیہہ کے لیے ایٹم میں جو پر اسرار طاقت

فرض کی گئی ہے، اسی کا نام کمزور نیوکلیر فورس ہے۔ سائنس داں یہ یقین کرتے رہے ہیں کہ انھیں چار طاقتوں کے تعامل (interactions) سے کائنات کے تمام واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ مگر سائنس عین اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ وحدت کی کھوج میں رہتی ہے۔ کائنات کا سائنسی مشاہدہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات انتہائی ہم آہنگ ہو کر چل رہی ہے۔ یہ حیرت ناک ہم آہنگی اشارہ کرتی ہے کہ کوئی ایک قانون ہے، جو فطرت کے پورے نظام میں کارفرما ہے۔ چنانچہ طبیعیات مستقل طور پر ایک متحدہ اصول (unified theory) کی تلاش میں ہے۔ سائنس کا ''ضمیر'' متواتر اس جدو جہد میں رہتا ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کی تعداد کو کم کرے اور کوئی ایک ایسا اصولِ فطرت (principle of nature) دریافت کرے جو تمام واقعات کی توجیہہ کرنے والا ہو۔

آئن اسٹائن نے مذکورہ قوانین میں سے پہلے دو قوانین کشش اور برقی مقناطیسیت کے اتحاد (unification) کی کوشش کی، اور اس میں 25 سال سے زیادہ مدت تک لگا رہا، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی موت سے کچھ پہلے اس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ میری تمنا تھی کہ میں اور زیادہ ریاضی جانتا تا کہ اس مسئلے کو حل کرلیتا۔

ڈاکٹر عبد السلام (1926-1996) اور دوسرے دو امریکی سائنس دانوں، شیلڈن لی گلاشو (Sheldon Lee Glashow [b. 1932]) اور وین برگ (Steven Weinberg [b. 1933]) کو 1979 میں طبیعیات کا جو مشترکہ نوبل انعام ملا ہے، وہ ان کی اسی قسم کی ایک تحقیق پر ہے۔ انھوں نے مذکورہ قوانین فطرت میں سے آخری دو قانون (طاقتور اور کمزور نیوکلیر فورس) کو ایک واحد ریاضیاتی اسکیم میں متحد کر دیا۔ اس نظریے کا نام جی ایس ڈبلیو نظریہ (G-S-W Theory) رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ دونوں قوانین اصلاً ایک ہیں۔ اس طرح انھوں نے چار کی تعداد کو گھٹا کر تین تک پہنچا دیا ہے۔

سائنس اگر چہ اپنے کو ''کیا ہے'' کے سوال تک محدود رکھتی ہے، وہ ''کیوں ہے'' کے سوال تک جانے کی کوشش نہیں کرتی۔ تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، وہ اتنی

پیچیدہ اور حیرت ناک ہے کہ اس کو جاننے کے بعد کوئی آدمی ''کیوں ہے'' کے سوال سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میکسویل ([1879-1831] James Clerk Maxwell) وہ شخص ہے، جس نے برقی مقناطیسی تعامل (electromagnetic interaction) کے قوانین کو ریاضی کی مساواتوں (equations) میں نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کیا۔ انسان سے باہر فطرت کا جو مستقل نظام ہے اس میں کام کرنے والے ایک قانون کا انسانی ذہن کی بنائی ہوئی ریاضیاتی مساوات میں اتنی خوبی کے ساتھ ڈھل جانا اتنا عجیب تھا کہ اس کو دیکھ کر بولٹزمن بے اختیار کہہ اٹھا — کیا یہ خدا تھا جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں جو دل میں حیرت انگیز خوشی بھر دیتا ہے:

Was it a God that wrote these signs, revealing the hidden and mysterious forces of nature around me, which fill my heart with quiet joy?

اختیار اور بے اختیاری

مشہور سائنس داں آئن اسٹائن نے طبیعیاتی دنیا کے اصول کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے— توانائی نہ پیدا کی جاسکتی، اور نہ ختم کی جاسکتی:

Energy can be neither created nor destroyed. (Julian Schwinger: *Einstein's Legacy: The Unity of Space and Time*, p. 117)

یہ واقعہ خالق کی قدرتِ کاملہ کا ثبوت ہے۔ انسان موجودہ دنیا کو صرف استعمال کرسکتا ہے۔ وہ اس کو بدلنے یا اس کو مٹانے پر قادر نہیں۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں مالک کی حیثیت سے نہیں ہے، بلکہ صرف تابع کی حیثیت سے ہے۔ اسی صورتِ حال کو مذہب کی اصطلاح میں امتحان کہا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں صرف اس لیے آتا ہے تاکہ وہ محدود مدت میں یہاں رہ کر اپنے امتحان کا پرچہ پورا کرے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ کسی اور چیز کا اس کو مطلق اختیار نہیں۔

بعض انسان دنیا کے حالات سے مایوس ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو ختم یا معدوم کر رہے ہیں، مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح دنیا کی اُس توانائی کو مٹایا نہیں جاسکتا جو مادہ کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں اس توانائی کو مٹانا بھی ممکن نہیں، جو انسان کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔ انسان کے اختیار میں خودکشی ہے، مگر انسان کے اختیار میں معدومیت نہیں۔ یہ صورتِ حال علامتی طور پر بتاتی ہے کہ انسان کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔

انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حقیقتِ واقعہ کا انکار کردے۔ مگر حقیقتِ واقعہ کو بدلنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ سرکشی کرے۔ مگر سرکشی کے انجام سے خود کو بچانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی پابندی کو قبول نہ کرے۔ مگر اخلاق کی مطلوبیت کو کائنات سے ختم کرنا، اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ مگر اس کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی چاہت کو ایک یونیورسل اصول کی حیثیت دے دے، جس کے مطابق تمام انسانوں کا فیصلہ کیا جائے گا— انسان اس دنیا میں آزاد ہے، مگر اس کی آزادی محدود ہے، نہ کہ لامحدود۔

طبیعیات سے مابعد الطبیعیات کی تصدیق

1977 میں لندن سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے، جس کا نام ہے ''قاموس جہالت''۔ اس میں ان حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے انسان ابھی تک لاعلم ہے:

The Encyclopaedia of Ignorance
Everything You Ever Wanted to Know About the Unknown

اس میں ساٹھ مشہور سائنسداں مختلف علمی شعبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کن چیزوں کے بارے میں ابھی تک لاعلم ہے:

> Compared to the pond of knowledge, our ignorance remains atlantic. Indeed the horizon of the unknown recedes as we approach it. The usual encyclopedia states what we know. This one contains papers on what we do not know, on matters which lie on the edge of knowledge.

یہاں ان میں سے دس مختلف سائنس دانوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے، جس کو سنڈے ٹائمس لندن نے شائع کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی شعبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے شعبے کی واحد سب سے بڑی نامعلوم حقیقت کیا ہے:

1۔ کائنات اتنی یکساں کیوں

آئن رکسبرگ (Ian W. Roxburg)، پروفیسر تطبیقی ریاضیات، کوئن میری کالج، لندن: کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کیے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد وشمار پر مشتمل ہیں۔ جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلے میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود

کے لیے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

2۔ کیا کوئی زڈ ذرہ ہے

ڈاکٹر عبدالسلام (1996-1926)، پروفیسر نظری طبیعات، امپیریل کالج، لندن: اگلے دس برسوں میں ہمیں یا تو زڈ ذرہ کا وجود تسلیم کرنا ہے، یا یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کا وجود ثابت ہو گیا، جیسا کہ موجودہ نظریے کی پیشین گوئی ہے تو اس کے بعد عالم فطرت کی چار طاقتیں جن کا ہمیں علم ہے ان میں سے دو طاقتوں کا ایک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (وہ چار طاقتیں یہ ہیں: کشش، برقی مقناطیسیت، طاقت ور نیوکلیر فورس جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کو آپس میں باندھے رکھتی ہے، اور کمزور نیوکلیر فورس جو ریڈیائی لہروں سے متعلق ہے)۔ پروفیسر عبدالسلام اور دوسرے سائنس دانوں نے حال میں کمزور نیوکلیر فورس اور برقی مقناطیسیت کو ایک ثابت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ زڈ ذرہ کی دریافت سے قوی تجرباتی تائید حاصل ہوگی۔

3۔ ڈی این اے سے پہلے کیا تھا

ڈاکٹر گراہم کیرنس اسمتھ (2016-1931)، لکچرر کیمسٹری، گلاسگو یونیورسٹی: ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک نیا جنیٹک مادہ دریافت کریں جو ڈی این اے سے بالکل مختلف ہو۔ (ڈی این اے کا دہرا مرغولہ نما ڈھانچہ کیمبرج میں 1953 میں فرانسس کریک اور جیمس واٹسن [James Dewey Watson, b. 1928] نے دریافت کیا تھا)۔ مجھے یقین نہیں کہ ڈی این اے ابتدائی زمین پر بن سکتا تھا۔ ضروری ہے کہ زندگی کسی اور چیز سے شروع ہوئی ہو اور ڈی این اے کا ارتقا بعد میں ہوا ہے۔

4۔ جین کس طرح متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں

سر جان کینڈریو (1997-1917)، چیرمین یوروپین مالے کیولر بیالوجی آرگنائزیشن، ہائڈلبرگ: جین کس طرح بیکٹیریا میں متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں، ان کے بارے میں ہم کو کو

کچھ معلوم ہے۔ مگر اعلیٰ حیوانات میں یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے، اس کی بابت ہم کچھ بھی نہیں جانتے ۔(جین کے متحرک اور غیر متحرک ہونے ہی کی وجہ سے ایسا ہے کہ ایک جسم کے سل (cells)، جو سب کے سب ایک قسم کے جین پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ مختلف قسم کے عمل کر پاتے ہیں اورنسوں، جلد، وغیرہ کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں)۔

5۔ ہمارے اندر مدافعتی نظام کیوں

جسم کا مدافعتی نظام (immune system) ہم کو چھوت سے بچاتا ہے۔ یہی ہمارے اندر الرجی کا سبب ہے، اور اعضاء کی پیوند کاری کو اس قدر مشکل بنا دیتا ہے۔ مگر اڈنبرا یونیورسٹی، اسکاٹ لینڈ، کے ڈاکٹر میکلم (Dr H. Spedding Micklem) کے نزدیک "سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ مدافعتی نظام کیسے کام کرتا ہے، بلکہ یہ کہ خود اس کا وجود ہی کیوں ہے۔ بے ریڑھ کے جانور اس کے بغیر بھی اچھی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ مگر ریڑھ دار حیوانات میں یہ نظام ناقابلِ یقین حد تک پیچیدگی کے ساتھ شامل ہے۔ پچھلے دس سالوں سے اس خیال کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ اس نظام کی ضرورت اس لیے تھی کہ خلیے (Cells) کی سطح میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو سرطان کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا پتہ لگایا جاسکے، مگر بہت سی حالیہ دریافتیں اس کی تائید کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔

6۔ ارتقا کی پیمائش ہم کیسے کریں

جان مینرڈ اسمتھ (1920-2004)، پروفیسر حیاتیات (Biology)، سسیکس یونیورسٹی، کا خیال ہے کہ ارتقا کا نظریہ ایک ناقابلِ حل اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے۔ نظریہ ارتقا کے تین حقیقی اجزاء ہیں— تغیر (جین میں تبدیلی کا واقع ہونا)، انتخاب (فرق کا باقی رہنا یا مختلف اقسام کی زرخیزی)، اور نقلِ مکانی۔

یہ نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، اکثر حالات میں ناقابلِ پیمائش حد تک نچلی سطح پر، ارتقا کے عمل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اس طرح ہم تین طریقوں سے واقف ہیں، جن

کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ ارتقا کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس ایک ریاضیاتی نظریہ ہے جو ہم کو بتا تا ہے کہ یہ تینوں طریقے ایسی سطحوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، جن کی بالواسطہ پیمائش کی ہم امید نہیں رکھتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے پاس برقی مقناطیسیت کا ایک نظریہ تو ہو مگر ہمارے پاس نہ تو برقی لہروں کو ناپنے کا کوئی ذریعہ ہو اور نہ مقناطیسی زور کو ناپنے کا۔

7۔نظامِ عصبی کس طرح بنتا ہے

فرانسس کریک (1916-2004)، سالک انسٹی ٹیوٹ (Salk Institute for Biological Studies)، کیلی فورنیا: حیاتیاتی ترقیات میں شاید سب سے بڑا علمی چیلنج یہ سوال ہے کہ ایک جاندار میں عصبی نظام کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بہت سال پہلے امریکن نوبل انعام یافتہ سائنٹسٹ راجر اسپری (Roger Wolcott Sperry, [1913-1994]) نے تجربہ کر کے دکھایا تھا کہ اگر ایک دریائی چھپکلی کی آنکھ اس طرح نکالی جائے کہ اس کی نظر کی نس آنکھ سے دماغ تک ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھ کو دوبارہ الٹ کر بھی لگا دیا جائے تو نظر کی نس آنکھ کے پردے سے دوبارہ شروع ہو کر دماغ کی طرف بڑھے گی، اور دوبارہ اس سے جڑ جائے گی۔ کچھ عرصے کے بعد جانور اِس آنکھ سے دوبارہ دیکھ سکتا تھا، مگر ہمیشہ الٹی شکل میں (کیونکہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی) ۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ نیا تعلق بالکل درست تھا۔سوائے اس کے کہ آنکھ کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ نتائج بتا رہے ہیں کہ اعصاب کے ایک نظام کو اعصاب کے دوسرے نظام سے ٹھیک ٹھیک مربوط کرنے کے لیے بہت ہی درست اور پیچیدہ طریقے کارفرما ہوتے ہیں۔مگر یہ طریقِ عمل کیا ہے، اس کو ہم متعین طور پر نہیں جانتے۔ (دوسرے لفظوں میں خود یہ واقعہ کہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رابطے کس قدر متعین ہوتے ہیں)۔

8۔ کوانٹم نظریہ کیا کشش کے نظریے پر بھی چسپاں ہوتا ہے

سر ہرمن بونڈی (1919-2005)، چیف سائنٹسٹ، شعبۂ انرجی: اگر ہم آئن سٹائن کے مقبول عام نظریۂ کشش کو مانیں تو کسی مقناطیسی میدان کے مرکز میں یکا یک تبدیلی (مثلاً دو ستاروں

میں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہوں) سے ایسا ہونا چاہیے کہ کشش کی لہریں روشنی کی سی رفتار سے پیدا ہوں۔ ریڈی ایشن کی دوسری تمام صورتیں ''کوانٹم'' کے مطابق ہوتی ہیں۔ یہ بات بمشکل قابلِ فہم ہے کہ کشش کی لہریں مقداروں کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ مگر ابھی تک کوئی اس بات کو ثابت نہیں کرسکا ہے، حالاں کہ بہت سے لوگ اس کی کوشش کر چکے ہیں۔

9۔ دماغ کے مختلف حصے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں

پروفیسر ہوریس بارلو (پیدائش 1921)، کیمبرج: ہم تقریباً مکمل طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ دماغ کے مختلف حصے کیوں کر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس وقت دماغ کے سننے والے حصے میں اور بقیہ حصوں میں کس قسم کا ارتباط قائم ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی مانوس آواز کو پہچانتے ہیں۔ تم بول کر مثال میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ مگر وہ ایک بچے کی تتلاہٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ہوتی ہے، جو خود بھی صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ دماغ کے اندر عصبی حرکات صوتی لہروں کے مساوی ہوتی ہیں۔ مگر ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح بامعنی ہو جاتی ہیں۔

10۔ انسان کب سے زمین پر ہے

ڈاکٹر ڈونالڈ جانسن (پیدائش 1943)، میوزیم آف نیچرل ہسٹری، کلیولینڈ، اوہایو: یورپ افریقہ اور ایشیا میں جو فوسلز (fossils) برآمد ہوئے ہیں، وہ انسان کی ابتدا کو اور زیادہ پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بہر حال یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ ارتقا کا معاملہ (سابقہ تصور کے خلاف) کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ مدت جس کا تعین ایک مسئلہ ہے، وہ تین ملین سے لے کر دس ملین سال پیچھے تک ہے۔ انسان کے امکانی آباواجداد میں بہ ظاہر بہت زیادہ فرق رہا ہے، اور ہم کو نہیں معلوم کہ ان کے درمیان باہمی رشتہ کیا تھا (اس کی وجہ جزئی طور پر ڈاکٹر جانسن کی حبش میں دریافتیں ہیں۔ نیز اس سے بھی زیادہ قدیم فوسلز پاکستان میں ملے ہیں)۔

THE TOP TEN SECRETS OF SCIENCE

In The Encyclopaedia of Ignorance, to be published next

Thursday, some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world. They write at very different levels, at very different lengths. However, last week we contacted some of the authors dealing with major branches of science and asked them to name a single unsolved problem which they personally found especially important or interesting. They give their choices below, together with those of two—Professor John Maynard Smith and Dr. Francis Crick—who could not be contacted, and which have been taken directly from the book.

1: Why is the universe so uniform? Ian Roxburg, Professor of Applied Mathematics, Queen Mary College, London: "the universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the'mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"

2: Is there a, Z-particle? Abdul Salam, Professor of Theoretical Physics, Imperial College, London."In the fleet decade we need to confirm or disprove the existence of the so-called Z-particle. If it does turn out to exist as predicted by current theory, it will clinch the unification of two of the four forces we know in nature. [The four forces are gravity, electro-magnetism, the strong nuclear force that binds the atomic nucleus together, and the weak nuclear force involved in radioactivity. Recently, Professor Salam and others have made some progress towards unifying the weak nuclear force and electromagnetism. The discovery of the Z-particle would lend strong experimental support.]

3: What preceded DNA? Dr Graham Cairns-Smith, lecturer in chemistry, University of Glasgow. "We need to discover a new genetic material as different as you like from DNA. [The double helix structure of DNA was discovered by Francis Crick and

James Watson in Cambridge in 1953.] I do not believe that DNA could have been made on the primitive earth. Life must have started with something else and DNA evolved later."

4: How are genes switched on and off? Sir John Kendrew, Chairman of the European Allender Biology Organisation, Heidelberg. "We know something about how genes are switched on and off in bacteria, but next to nothing about how it is done in higher animals? [It is by switching genes on and off that the cells of a single organism, which all contain the same set of genes, are able to do such different jobs, and become constituents of nerves, skin, etc.]

5: Why do we have an immune system? The body's immune system defends us against infection, is responsible for allergies, and makes organ transplant so difficult. But according to Dr. H. S. Micklem of the University of Edinburgh, "The most interesting question is not how the immune system works, but why it is there at all: Invertebrates seem to get along quite well without one, but it is incredibly complicated in vertebrates. The idea that it was needed to detect small changes in the cell surface which might lead to cancer has been popular in the last ten years but there is a lot of data to suggest it is not good enough."

6: How can we measure evolution? John Maynard Smith, Professor of Biology, University of Sussex, thinks that the theory of evolution has a built-in problem."The essential components of the theory of evolution are mutation (a change in a gene), selection (differential survival or fertility of different types) and migration. The theory tells us that each of these processes, at a level far too low to be measurable in most situations, can profoundly affect evolution. Thus we have three processes which we believe to determine the course of evolution, and we have a mathematical theory which, tells us that these processes can produce their effects at levels we cannot usually hope to measure directly. It is as if we had a theory of electromagnetism but no means of measuring electric current or magnetic force."

7: How is the nervous system built? Francis Crick, Salk Institute, California. "Perhaps the most challenging problem in the whole

of developmental biology is the construction of the nervous system of an animal. Many years ago it was shown by Roger Sperry that if a newt's eye was removed, so that the optic nerve from its eye to its brain was broken, then even if, the eye was replaced upside down, the optic nerve would regenerate from the retina, grow towards the brain and connect up again. After a period, the animal could see again with this eye, but it always saw upside down. In other words, the new connection had been made 'correctly' except that the eye did not know it had been inverted. The results show that fairly precise processes are at work to make the correct, rather intricate, connections needed between one set of nerves and another but exactly what these mechanisms are we do not yet know." [In other words, the very fact that it was upside down shows how specific the links are.]
8: Does the quantum theory apply to gravity? Sir Herman Bondi, Chief Scientist, Department of Energy. "If we follow Einstein's widely accepted theory of gravity then any rapid change in the source of a gravitational field —two stars orbiting round each other, for example–.should radiate gravitational waves at the spend of tight. All other forms of recitation are'quantised,'that is to say they are not continuous but come in discrete but minute packets. It is hardly conceivable that gravitational waves are quantised too, but nobody has yet succeeded in establishing the equations, though Many have tried."
9: How do different parts of the brain link up? Professor Horace Barlow, Cambridge. "We are almost totally ignorant about how different parts of the brain communicate with one another. For example, what goes on between the parts of the brain concerned with hearing and the rest when we recognise a familiar voice? You can draw an analogy with speech. It is carried by sound waves, but it is far more meaningful than the babbling of a baby which is carried by sound waves, too. In the brain nervous' impulses are the equivalent of soundwaves, but we have no idea of how they become meaningful."
10: How old is man? Dr Donald C. Johnson, Museum of Natural History, Cleveland, Ohio. "Fossil discoveries in Europe Africa

and Asia are pushing human origins further back in time. However, it is becoming increasingly clear that the scenario of human evolution is much more complex. The probable time is three to ten million years ago. There appears to have been a great diversity of possible human ancestors and we don't know how were related. [This is due partly to Johanson's discoveries to Ethiopia and others, of even older fossils, made in Pakistan]

(*Sunday Times*, London, December 4, 1977, p. 13)

تبصرہ

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہے، جس کی توجیہہ خالق کو مانے بغیر نہیں ہوسکتی۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات میں عددی تناسب ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق میں ایک ریاضیاتی ذہن کام کررہا ہے۔ انسان کی بناوٹ میں اتنی حکمتیں کارفرما ہیں کہ کوئی بھی طبیعیاتی توجیہہ اس کی تشریح کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ ایک جاندار کی آنکھ نکال کر اس کو دوبارہ الٹ کر لگا دیا جائے تو وہ جاندار اب بھی دیکھے گا۔ مگر اس کو ہر چیز الٹی دکھائی دے گی۔ جسم کے مختلف اجزاء جو انتہائی صحت کے ساتھ کام کرتے ہیں، وہ ایک بے حد نازک ترکیب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آواز سائنسی اعتبار سے کچھ لہروں کا نام ہے، مگر یہ لہریں انسان کے دماغ میں داخل ہوکر بامعنی کلام کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ اس قسم کے بے شمار عجائب ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دنیا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ ذہن ہے، جو زبردست طاقت کے ساتھ اس کو کنٹرول کررہا ہے۔ کائنات کے نظم اور معنویت کی اس کے سوا کوئی اور توجیہہ نہیں کی جاسکتی — دنیا کے بارے میں انسان کی لاعلمی ایک بہت بڑے علم کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ علم کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جو اس کو حد درجہ حکمت کے ساتھ چلا رہا ہے۔ ان علمی تحقیق کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے — علم کا دریا حیرت انگیز طور پر خدا کے اقرار کی طرف بڑھ رہا ہے۔

موجودہ زمانے میں ہونے والی طبیعی تحقیقات حیرت انگیز طور پر انسان کو ''مافوق الطبیعی''

منزل پر پہنچا رہی ہیں۔ ہر علمی شعبے میں یہ صورت حال پیش آرہی ہے کہ محققین اپنی تلاش وجستجو میں جب آگے بڑھتے ہیں تو بالآخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعی قانون کی حد ختم ہوگئی اور مافوق الطبیعی قوتوں کی کارفرمائی شروع ہوگئی۔

مثلاً انسانی دماغ کی بناوٹ پچاس سال پہلے تک، ایک راز سمجھی جاتی تھی۔ آج سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ راز کے اوپر سے بہت سے پردے ہٹانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مگر انسانی دماغ کے بارے میں معلومات میں جو اضافہ ہوا ہے، وہ حیرت انگیز طور پر قدیم مفروضات کی تردید کررہا ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسانی دماغ میوسین دور (Miocene Period) کے بعد چودہ ملین سال میں ترقی کرکے موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ مگر موجودہ معلومات بتاتی ہیں کہ انسانی دماغ، سابقہ قیاس، اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ مذکورہ مدت اس کے ارتقا کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتی۔

انسانی دماغ کے سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ وہ ''موڈ'' کو کس طرح بدلتا ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں نے دواؤں کے ذریعے مصنوعی طور پر موڈ کو بدلنے کی کوشش کی۔ یہ دوائیں مختلف کیفی حالات کو گھٹا بڑھا سکتی تھیں یا ان کو بدل سکتی تھیں۔ مثلاً نیند کو کم یا زیادہ کرنا، جنسی جذبات کو متاثر کرنا، حافظہ (memory) کی کارکردگی گھٹانا بڑھانا، وغیرہ۔ مگر اس میدان میں تحقیق کرنے والے اپنی تحقیق کے نتائج سے کسی قدر گھبرا رہے ہیں۔ کیوں کہ انھیں معلوم نہیں کہ وہ حقیقتاً کس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں:

> The researchers are slightly perturbed since they feel they don't know where they are really headed. Perhaps they are stepping into the realm of metaphysics.

شاید وہ مابعد الطبیعیات کی دنیا میں داخل ہورہے ہیں۔ (بحوالہ ٹائمس آف انڈیا، 28 جنوری 1978)

علم کی شہادت

قرآن کی سورہ الانشقاق کی چند آیتیں یہ ہیں: فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ فَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (84:16:20)۔ یعنی پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے۔ اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے، کہ تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے، تو انھیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے:

...you will progress from stage to stage, so what is the matter with them that they believe not. (84:19-20)

قرآن کی یہ آیتیں ساتویں صدی عیسوی کے رُبعِ اول میں اتریں۔ اُس وقت اِن آیتوں میں ایک ایسا بیان دیا گیا جو ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اکیسویں صدی کے بعد تک پھیلا ہوا تھا۔ بعد کے حالات نے قرآن کی اِس پیشین گوئی کو عین درست ثابت کیا۔ یہ واقعہ، دوسرے واقعات کی طرح، اِس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کی کتاب ہے، کیوں کہ عالم الغیب کے سوا کوئی اور مستقبل کے بارے میں اِس قسم کا بیان دینے پر قادر نہیں۔ علمِ انسانی کی تاریخ بتاتی ہے کہ کائنات کے بارے میں انسان کا مطالعہ جاری رہا، یہاں تک کہ برٹش سائنس داں نیوٹن کے زمانے میں یہ فرض کرلیا گیا کہ کائنات کا بلڈنگ بلاک، مادّہ (matter) ہے۔ مگر انسانی علم کا سفر مزید آگے بڑھا۔ بعد کی تحقیقات نے اِس مفروضے کی تردید کردی۔ جرمن سائنس داں آئن سٹائن کے زمانے میں یہ مفروضہ قائم کیا گیا کہ کائنات کا بلڈنگ بلاک، انرجی (energy) ہے۔ مگر انسانی علم کا یہ سفر مزید آگے بڑھا۔ بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ مفروضہ درست نہ تھا۔ فریڈ ہائل (Fred Hoyle) کے زمانے میں یہ دریافت ہوا کہ کائنات کا بلڈنگ بلاک انٹیلیجنس (intelligence) ہے۔ انسانی علم کا یہ سفر جاری رہا، یہاں تک کہ اکیسویں صدی میں علمی اعتبار سے یہ دریافت ہو گیا کہ کائنات میں ایک انٹیلجنٹ ڈزائن (intelligent design) موجود ہے۔

خدا کا وجود

سر مائیکل فرانسس اَتیا(Sir Michael Francis Atiyah) ممتاز برٹش ریاضی داں ہیں۔ ان کی پیدائش 1929 میں ہوئی، اور وفات 2019 میں۔ وہ ایک مرتبہ ممبئی آئے تھے۔ وہاں انھوں نے کہا کہ خدا ایک ریاضی داں ہے۔ خدا کو ریاضی داں قرار دینے کا نظریہ نیا نہیں ہے۔ تقریباً 50 سال پہلے سر جیمس جینز نے کہا تھا کہ کائنات ایک ریاضی داں کا عمل ہے۔ اس سے بھی صدیوں پہلے فیثاغورث (Pythagoras) نے کہا تھا کہ تمام چیزیں دراصل گنتیاں ہیں۔ پکاسو (Pablo Picasso) کے نزدیک خدا ایک آرٹسٹ ہے۔ اس نے کہا کہ خدا فی الواقع دوسرا آرٹسٹ ہے۔ اس نے زرافہ ایجاد کیا۔ اس نے ہاتھی بنایا۔ اس نے بلی بنائی۔ آئن سٹائن نے کہا تھا خدا لطیف ہے، اور اگرچہ وہ کسی کا برا چاہنے والا نہیں، مگر وہ بہت ہوشیار ہے:

> The distinguished mathematician, Sir Michael Francis Atiyah, who was recently in Bombay said that"God was a mathematician." The idea of God being a mathematician is not new. About 50 years ago, Sir James Jeans suggested that the universe was the handiwork of a mathematician. And centuries before him Pythagoras said all things are numbers. To Picasso God was an artist. "God is really another artist," he said."He invented the giraffe, the elephant and the cat." Einstein has said that the Lord is subtle and, though not malicious, very clever.

جو شخص بھی کائنات کو زیادہ گہری نظر سے دیکھتا ہے اس کو ایک چیز کا یقینی احساس ہوتا ہے — یہاں کوئی اور ہے جو سب سے بڑا ہے اور خود اس کی اپنی ذات سے بھی۔ ریاضی داں کو کائنات میں ایسی اونچی ریاضی نظر آتی ہے جہاں اس کو اپنی ریاضی بھول جاتی ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدا بہت بڑا ریاضی داں ہے۔ ایک آرٹسٹ جب کائنات کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو یہاں اس کو

اتنا اعلیٰ آرٹ نظر آتا ہے کہ اس کا اپنا آرٹ اس کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدا سب سے بڑ آرٹسٹ ہے۔ ایک عقل والا آدمی جب کائنات کی حکمتوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں کوئی اور ہے جو تمام عقلوں سے زیادہ بڑی عقل والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سب سے بڑا ریاضی داں، سب سے بڑا آرٹسٹ، سب سے بڑا عاقل ہے اور اسی کے ساتھ وہ مزید بہت کچھ ہے۔ جو شخص کائنات میں خدا کے نشان کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے اور جو شخص دیکھ کر بھی اس کو نہ مانے وہ مجنون ہے۔

انکارِ خدا

تجزیاتی مطالعہ

لامحدود کائنات، انسانی محدودیت

پچھلے تقریباً پانچ سو سال سے کائنات کا سائنسی مطالعہ جاری ہے۔ اِس مطالعے میں بڑے بڑے دماغ شامل رہے ہیں۔ آخری بات جہاں یہ سائنسی مطالعہ پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات اتنی زیادہ وسیع ہے کہ انسان کے لیے اُس کو اپنے احاطے میں لانا بہ ظاہر ناممکن ہے۔ تازہ ترین سائنسی تحقیق کے مطابق، انسان کا علم بہ مشکل کائنات کے صرف پانچ فی صد حصے تک پہنچا ہے۔ اِس پانچ فی صد حصے کے معاملے میں بھی انسانی علم کی محدودیت کا یہ عالم ہے کہ ایک سائنس داں نے کہا کہ ہم جتنا دریافت کرپاتے ہیں، اُس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریافت شدہ چیزیں بھی ابھی تک غیر دریافت شدہ چیزوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less.

تخلیق (creation) کے بارے میں جاننا خالق (Creator) کے بارے میں جاننا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ابھی تک انسان خالق کی تخلیق کے بارے میں بھی صرف چند فی صد جان سکا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کا یہ مطالبہ کرنا کہ خالق کے بارے میں ہم کو قطعی معلومات دو، سرتاسر ایک غیر علمی مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک تخلیق کے بارے میں پورا علم حاصل نہ کرسکا تو وہ خالق کے بارے میں پورا علم کیسے حاصل کرسکتا ہے۔

تخلیق کا وجود زمان ومکان (space and time) کے اندر ہے، اور خالق کا وجود ماورائے زمان ومکان (beyond space and time) سے تعلق رکھتا ہے، پھر جو انسان اتنا محدود ہو کہ وہ زمان ومکان کے اندر کی چیزوں کا بھی احاطہ نہ کرسکے، وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقت کو اپنے احاطے میں کس طرح لاسکتا ہے — حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان خدا کو صرف عجز کی سطح پر دریافت کرسکتا ہے، نہ کہ علم کی سطح پر۔

خدا کا تصور

سیکولر فکر رکھنے والے متعدد اہلِ علم نے یہ بات کہی ہے کہ خدا کا کوئی حقیقی وجود نہیں، وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہے — خدا، انسان کی ایک عظیم ایجاد ہے (God is a great invention by man)۔ یہ صرف ایک ورڈ پلے (word play) ہے۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اِس طرح کہا جائے — انسان، خدا کی ایک عظیم تخلیق ہے:

Man is a great creation by God

خدا کے وجود کے بارے میں علمی غور وفکر سب سے پہلے فلسفے میں شروع ہوا۔ فلسفہ اِس معاملے میں کسی حتمی انجام تک نہ پہنچ سکا۔ گلیلیو اور نیوٹن کے بعد غور وفکر کا سائنسی انداز شروع ہوا۔ سائنس کا موضوع اگر چہ خالق نہیں ہے، بلکہ اس کے اپنے الفاظ میں، نیچر (nature) ہے۔ مگر نیچر کیا ہے۔ نیچر تخلیق کا دوسرا نام ہے۔ گویا سائنس کا موضوع ہے — خالق کے حوالے کے بغیر مخلوق (creation) کا مطالعہ کرنا۔ سائنسی مطالعے میں پہلے، نیوٹن کے زمانے میں، یہ مان لیا گیا تھا کہ دنیا ایک میکانکل ڈزائن (mechanical design) ہے۔ اس کے بعد ردرفورڈ (Ernest Rutherford [1871-1937]) کے زمانے میں معلوم ہوا کہ دنیا ایک بامعنی ڈزائن (meaningful design) ہے۔ اِس کے بعد فریڈ ہائل (Fred Hoyle) کا زمانہ آیا، جب کہ یہ دریافت ہوا کہ دنیا ایک انٹیلجنٹ ڈزائن (intelligent design) ہے۔

اِن دریافتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا کا وجود علمی طور پر دریافت ہو چکا ہے۔ اب سارا معاملہ صرف تسمیہ (nomenclature) کا ہے، یعنی یہ کہ اِس دریافت شدہ حقیقت کا نام کیا ہو۔ فلسفیوں نے اِس حقیقت کو ورلڈ اسپرٹ (world spirit) کہا تھا۔ سائنس اِس کو انٹیلجنٹ ڈزائن کہہ رہی ہے۔ اہلِ مذہب کی زبان میں اِسی حقیقت کا نام خدا (God) ہے۔ سائنس نے صرف تخلیق کو دریافت کیا، لیکن تخلیق کے دریافت کے ساتھ ہی خالق اپنے آپ دریافت ہو جاتا ہے۔

مخالفین مذہب کا استدلال

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادّہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہوگئے اسی طرح پچھلی صدیوں میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (knowledge explosion) ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اُڑ گئے ہیں"۔ (ہندستان ٹائمس، سنڈے میگزین، 23 ستمبر 1961)

یہ جولین ہکسلے (وفات 1975) کے الفاظ ہیں۔ جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے۔ توجیہہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے۔ مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہنچا دیا، جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے۔ اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے، اسی طرح توجیہہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی انتہائی غلطیوں کی اصلاح کرسکے۔

اس طریقِ فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا اس لیے واقعات کی صحیح توجیہہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی، اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کرلیے۔ مگر ارتقا کے عالم گیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے، اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اٹکل پچو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیا کی حقیقت معلوم کی جائے۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کرلی گئی ہے۔ جدید طریقِ مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی بلکہ یہ محض دورِ لاعلمی کے قیاسات تھے، جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہوگئے ہیں۔ جولین ہکسلے کہتا ہے:

''نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے''۔

(*Religion without Revelation*, N. Y. 1958. p. 58)

طبیعاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے، جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابلِ تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کررہے ہیں۔ بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے ،جس کو قانونِ فطرت(law of nature) کا نام دیا گیا۔اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہوجاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اور قادر خدا ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہوسکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداءً کائنات کو حرکت دی ہو۔ چنانچہ شروع میں لوگ محرکِ اوّل کے طور پر خدا کو مانتے رہے۔ والٹیر(Voltaire [1694-1778]) نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے، جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کرکے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے، اوراس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔اس کے بعد ہیوم(David Hume [1711-1776]) نے اس ''بے جان اور بے کار خدا'' کو بھی یہ کہہ کر ختم کردیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے دیکھی ہیں۔لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں۔اس لیے کیوں کر ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے، جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا۔ واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں

ہوا۔ وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے۔ مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے۔ اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے، جو سورج کو نکالتا ہے، اور اس کو غروب کرتا ہے۔ اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا۔ اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے۔ مگر اب جب کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اَن دیکھی طاقت کام کر رہی ہے۔ وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعے کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی، جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا فوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ ''اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے'' — ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

> If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

> یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت پیش آتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے تحت پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

اب اس دلیل کو لیجیے، جو طبیعاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ ایک متعین قانونِ فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی توجیہہ کرنے کے لیے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لیے موجود ہیں۔ اس استدلال کا بہترین

جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا۔ اس نے کہا:

Nature is a fact, not an explanation.

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے۔ تمھارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لیے ہیں۔ مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے، وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے، جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں، جو کائنات کے پیچھے کام کررہے ہیں۔ جب کہ تمھاری دریافت صرف اس مسئلے سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔

جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعے کی توجیہہ۔ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیا ہے''۔ یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیوں ہے'' جب کہ توجیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے، اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ''خدا ایسا کرتا ہے''۔ مگر اب خوردبینی مشاہدہ (microscopic observation) کے بعد معلوم ہوا کہ جب 21 روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کرکے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفینِ مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کردیتا ہے کہ بچے کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔ کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک 21 روزہ قانون ہے، جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، جو بچے کو خول کے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدے نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ صرف واقعے کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس

نے واقعے کا اصل سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدے کے بعد صورتِ حال میں جو فرق ہوا ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ ''سینگ'' کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا، واقعے کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے۔ واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا، جب ہم جان لیں کہ بچے کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگالیں، جو بچے کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے، اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک 21 روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو، جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ ''خول کیسے ٹوٹتا ہے''۔ اور اب سوال یہ ہو گیا کہ ''سینگ کیسے بنتی ہے''۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات (Cecil Boyce Hamann [1913-1984]) کے الفاظ نقل کروں گا:

''غذا ہضم ہونے اور اس کے بدن کا جزء بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اب جدید مشاہدے میں وہ کیمیائی ردِّ عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی۔ آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردّ عمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدے کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعے عمل کرتا ہے جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔''

(*The Evidence of God in an Expanding Universe*, p. 221)

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں، کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی۔ کیونکہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہورہے ہیں، اوران کا آخری سبب کیا ہے۔ اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے۔

یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح (explaination) ہیں، جب کہ مذہب کی جگہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے۔ اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے۔ اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں۔ مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سببِ حرکت کا راز بھی معلوم کرلیا۔ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے، اور اپنے آپ چلی جارہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا ہے، اور اپنے آپ چلا جارہا ہے۔ ہیریز (Arthur Harris) نے یہی بات کہی تھی جب اس نے ڈاروِنزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

> Natural selection may explain the survival of the fittest, but cannot explain the arrival of the fittest.
>
> (*The Revolt against Reason* by A. Lunn, p. 133)

یعنی انتخابِ طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر باقی رہنے کی توجیہہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

کائنات بول رہی ہے

کیرالا کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے:

Nature and Science Speak about God

اخباری سائز کی اس 28 صفحے کی کتاب میں کائنات کے متعلق سائنسی دریافتوں کے حوالے سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ خدا کا وجود ایک حقیقت ہے اور اسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا— بچھو، بھڑ اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے پانی اور خشکی کے جاندار ہیں جو ڈنک مار کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں یا شکار کو قابو میں لاتے ہیں۔ ان کے ڈنک کی نوک پر ایک نہایت چھوٹا سوراخ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ ایک قسم کا زہر اپنے دشمن کے جسم میں داخل کر دیتے ہیں۔ یہ سوراخ اگر ڈنک کے بالکل سرے پر ہوتا تو ڈنک چبھوتے وقت سوراخ بند ہو جاتا۔ اس کے علاوہ خود چبھونے میں ڈنک زیادہ اچھی طرح کام نہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈنک کی نوک کا سوراخ ہمیشہ ذرا سا ترچھا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ڈاکٹر کی سرنج (syringe) میں ہوتا ہے۔'' یہ ایک بہت چھوٹی سی مثال ہے۔ اسی طرح جس چیز کو دیکھیے اس کے اندر ایک نہایت ذہین نقشہ سازی نظر آئے گی۔ کائنات کوڑا کرکٹ کا ایک بے ترتیب انبار نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر زبردست مقصدیت اور نظم پایا جاتا ہے۔ کیا ایک شعوری منصوبہ بندی کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے۔

دیمک اپنے قد کے مقابلے میں ہزار گنا بڑا مکان بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنی جسامت کی نسبت سے اتنا بڑا مکان بنائیں تو ہم کو ایک میل سے بھی زیادہ اونچی تعمیر کرنی پڑے گی۔ دیمک لکڑی میں رہ سکتے ہیں اور اسی کے اندر اپنے مکانات تراشتے ہیں، ان کی زندگی کے مطالعے سے بے شمار حیرت انگیز واقعات سامنے آئے ہیں۔ صرف ایک مثال لیجیے۔ دیمک لکڑی کو کھاتے ہیں۔ پتھر کے بعد لکڑی تمام معلوم چیزوں میں سب سے زیادہ عسیر الہضم (indigestible) ہے۔ مگر دیمک کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ اس مقصد کے لیے مخصوص جبڑے رکھتے ہیں جو آرے کا کام دینے کے ساتھ

ساتھ پیسنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ تاہم لکڑی خواہ کتنی ہی پیس ڈالی جائے، وہ بہر حال لکڑی ہی رہے گی، اور پیٹ میں جا کر غذا کی ضرورت پوری کرنے کے بجائے صرف بدہضمی پیدا کرے گی۔ پھر کیا چیز ہے، جو دیمک کی مدد کرتی ہے۔ اس کام کے لیے دیمک کی آنتوں میں نہایت چھوٹے چھوٹے خوردبینی کیڑے موجود ہیں۔ یہ کیڑے نگلی ہوئی لکڑی پر مخصوص عمل کر کے اس کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ ہضم ہو کر جزءِ بدن ہو سکے۔ یہ حیرت انگیز انتظام کون کرتا ہے۔

مرغی کے انڈے پر غور کیجیے۔ ہر ایک انڈے میں سات ایسی مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو اتنی اہم ہیں کہ ان میں سے ایک بھی اگر نہ ہو تو انڈا، انڈا نہ رہے گا— چونے کا خول، خول کے اندر مسامات جو ہوا کو گزرنے کا راستہ دیتے ہیں، پتلی جھلی جو اُستر کی طرح چاروں طرف ہوتی ہے، زردی اور سفیدی جو خول کے اندر بچے کی غذا ہیں، بچے کا جرثومہ، تار جو جرثومے کو صحیح رُخ پر باقی رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو انڈے سے الگ کر دیجیے، اور انڈا کبھی بھی چوزے کی پرورش گاہ نہیں بن سکے گا۔ کیا یہ سات مختلف چیزیں محض اتفاق سے یکجا ہو گئی ہیں۔ ''اتفاق'' ان سات مختلف چیزوں کی موجودگی کی تشریح نہیں کر سکتا، جو ٹھیک اور بالکل صحیح حالت میں پائی جا رہی ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اتفاق سے صرف یہی چیزیں کیوں اکھٹا ہوئیں۔ کیوں نہ درخت کی پتّی، کوئی لکڑی، پتھر کا ایک ٹکڑا اور اس طرح کی ہزاروں چیزیں جن کا موجود ہونا ممکن تھا، خول کے اندر آ گئیں، جن میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر وہاں ہوتی تو وہ سارے انڈے کو برباد کر دیتی۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب مرغی کا بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ انڈے سے باہر نکلے، اس وقت اس کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

خود اپنے وجود پر غور کیجیے۔ انسان کو جو جسم حاصل ہے وہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ دماغ کو دیکھیے۔ ایک ایسا ٹیلی فون اکسچینج جو ہر آن زمین کے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں سے تعلق جوڑے ہوئے ہو، ان سے پیغامات وصول کرتا ہو، اور ان کے نام پیغام بھیجتا ہو۔ اگر آپ ایک ایسے ٹیلی

فون ایکسچینج(exchange) کا تصور کرسکیں تو آپ دماغ کے ناقابلِ یقین حد تک پیچیدہ نظام کا صرف ایک ہلکا سا اندازہ کرسکتے ہیں۔

آپ کے دماغ(brain) کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (nerve cells) ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوئے ہیں جن کو عصبی ریشے (nerve fibres) کہتے ہیں۔ ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے۔

دل کو دیکھیے، اس کا اوسط قد چار انچ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کا وزن آٹھ اونس سے زیادہ نہیں ہوتا مگر انسانی جسم کا یہ چھوٹا سا پمپ رات دن مسلسل چلتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت دن میں ایک لاکھ بار ہوتی ہے اور وہ ہر تیرہ سکنڈ میں تقریباً ایک گیلن خون سارے جسم میں بھیج دیتا ہے۔ ایک سال میں دل جتنا خون پمپ کرتا ہے وہ اتنا ہوتا ہے جو ایک ایسی ٹرین کو پوری طرح بھر سکے، جو 65 بڑے بڑے تیل کے ویگن لیے ہوئے ہو۔ دل کی اس حیرت انگیز کارکردگی کو حاصل کرنے کے لیے عجیب وغریب ہنرمندی کے ساتھ اس کو موزوں ترین بنایا گیا ہے۔

کائنات میں اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جن کی صرف فہرست بنانے کے لیے ایک پوری لائبریری کی ضرورت ہوگی، جب کہ انسان کا علم کائنات کے موجود حقائق کی نسبت سے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے، وہ چیز جس کو دیکھنا ابھی باقی ہے۔

یہ حیرت انگیز کاریگری، یہ مکمل منصوبہ بندی، یہ اعلیٰ ترین ذہانت کیا محض اتفاق (chance) سے وقوع میں آ گئی ہے۔ بے شک بعض اوقات محض اتفاق سے بھی کوئی واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے۔ مگر اس قسم کا اتفاق محض جزوی اور خفیف تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے۔ وہ صرف اس مخصوص رنگ کے گلاب کی توجیہہ کرتا ہے، نہ کہ وہ گلاب کے پورے وجود کا سبب ہے۔ اتفاق ہرگز اس کی توجیہہ نہیں کرسکتا کہ ایک مخصوص قسم کا نظام اس قدر تسلسل کے ساتھ کیوں

جاری ہے۔ وہ ہم کو نہیں بتاتا کہ ہماری دنیا میں باقاعدگی اور تنظیم کیوں پائی جاتی ہے۔ ''اتفاق'' کا عمل کبھی بھی یکساں طور پر نہیں ہوسکتا۔ اتفاق کے لیے ممکن نہیں ہے کہ جو کچھ آج ہوا اسی کو کل بھی وجود میں لائے۔ پھر کیوں تمام چیزیں ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ ایک ہی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ان میں نظم اور باقاعدگی کیوں پائی جاتی ہے۔

کچھ دھات کے ٹکڑے ہوا میں اچھالے جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ڈھلے ہوئے حروف کی شکل میں زمین پر گریں اور گرتے ہی ایک بامعنی عبارت کی شکل میں کاغذ کے صفحے پر اکھٹا ہو جائیں۔ اگر ایسا محض اتفاق سے نہیں ہوسکتا تو یہ کیوں فرض کرلیا گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا اتنی حیرت انگیز خصوصیات کے ساتھ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے۔ ایک نظریہ جس کو کسی تجربہ گاہ میں ثابت نہیں کیا جاسکتا اس کو علمی طور پر منوانے کی کیا دلیل ہے۔

دوسری توجیہہ جس پر اتھیسٹ (atheist) انحصار کرتے ہیں، وہ قانونِ قدرت (nature) ہے۔ ''مرغی کے انڈوں سے بچے کیوں 21 روز میں نکلتے ہیں، اور شتر مرغ کے انڈوں سے 45 روز میں۔'' اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں، جن کا جواب منکرِ خدا (atheist) کے نزدیک یہ ہے کہ ''یہ ایک قانونِ فطرت ہے۔'' بظاہر یہ ایک توجیہہ ہے، مگر درحقیقت یہ جواب صرف ایک واقعے کو بیان کرتا ہے۔ قانونِ فطرت کا لفظ بول کر ہم صرف کائنات کے نظم اور اس کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ لفظ اس کی توجیہہ نہیں کرتا کہ یہ نظم اور کارکردگی کیوں قائم ہے۔ یہ لفظ صرف یہ بتاتا ہے کہ چیزیں ہمیشہ ایک متعین اصول کے تحت وجود میں آتی ہیں، اور ہمیشہ اسی طرح وجود میں آئیں گی۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے۔ وہ واقعے کا سبب نہیں بتاتا بلکہ صرف واقعے کی تصویر پیش کرتا ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزاء ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) جن کو سرخ ذرات کہا جاتا ہے۔

’’درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں؟‘‘

’’ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیموگلوبن (haemoglobin) ہے، یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو سرخ ہوجاتا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات آخر کہاں سے آئے۔‘‘

’’وہ آپ کی تلّی (spleen) میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا، وہ بہت عجیب ہے، مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرّات، تلّی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں، وہ اس قدر صحت کے ساتھ یک جا ہو کر کیسے عمل کرتی ہیں کہ میں سانس لیتا ہوں، میں دوڑتا ہوں، میں بولتا ہوں، میں زندہ ہوں۔‘‘

’’یہ قدرت کا قانون ہے۔‘‘

’’وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانونِ قدرت کہتے ہیں۔‘‘

’’اس سے میری مراد طبیعی اور کیمیاوی طاقتوں کا اندھا عمل ہے (Blind interplay of physical and chemical forces)۔‘‘

’’مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں، جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اُڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے اور ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔‘‘

’’میرے دوست، مجھ سے یہ نہ پوچھو، سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔‘‘

یہ سوال و جواب موجودہ سائنس کی حقیقت واضح کر رہا ہے۔ بے شک سائنس نے ہم کو بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں۔ مگر اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ صرف کچھ ہونے والے واقعات ہیں۔ وہ واقعات کیوں کر ہو رہے ہیں اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے۔ ایک مکھی کے نازک اعضا

کس طرح کام کرتے ہیں۔ بے شک سائنس نے اس سلسلے میں ہم کو بہت کچھ بتایا ہے، مگر وہ کون ذہن ہے، جس نے سوچا کہ مکھی کو ان نازک اعضا کی ضرورت ہے، اور اس کو کمال کاریگری کے ساتھ ایسے اعضا فراہم کیا۔ کائنات کے نظم اور اس کی موزونیت (appropriateness) کی تشریح کرنے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ مختلف قسم کی بے شمار اندھی طاقتیں ایک مخصوص انجام کی طرف اپنا عمل کیوں کرتی ہیں — ہم کو ان طاقتوں کی موجودگی کے سوا کس چیز کی ضرورت ہے۔ ایک بچھے ہوئے بستر کی تشریح محض اس طرح نہیں ہوسکتی کہ آپ چادر، تکیہ اور پلنگ کے نام لے لیں۔ ایک محل، نام ہے لاکھوں اینٹیں اور دوسری چیزیں اپنے صحیح ترین مقام پر نصب ہونے کا۔ انسانی جسم کے کسی چھوٹے سے چھوٹے عضو کے وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ کروروں ایٹم ایک منفرد اور مخصوص ترتیب کے ساتھ یک جا ہوں۔ اندھی طاقتیں ہرگز اس طرح کی مقصدیت کا اظہار نہیں کرسکتیں، وہ واقعات کے اندر معنویت اور ہم آہنگی پیدا نہیں کرسکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے، جو خود اپنے وجود کے لیے ایک توجیہہ کا طالب ہے۔ اس موقع پر مصنف کے الفاظ نقل کرنے کے قابل ہیں۔ وہ لکھتا ہے — قانونِ قدرت کائنات کی تشریح نہیں کرتا۔ وہ خود اس کا طالب ہے کہ اس کی تشریح کی جائے:

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation.

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز میں معنویت کا ہونا، اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ذہن کام کررہا ہے۔ زندگی کا جرثومہ جو ایک مرد کے جسم میں پرورش پاتا ہے، وہ جسم کے دوسرے خلیوں (cells) کے بالکل مشابہ ہوتا ہے، مگر اس میں دوسرے خلیوں سے بالکل مختلف خصوصیت ہوتی ہے، اس کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ عورت کے ایک خلیہ سے ہم آہنگ ہو کر مکمل طور پر ایک نیا انسان وجود میں لا سکے۔ یہ کس طرح ممکن ہوتا ہے کہ دو خلیے جن میں سے ہر ایک دو بالکل مختلف جسموں میں پرورش پاتے ہیں، وہ اس قدر حیرت انگیز طور پر باہم مل کر عمل کرنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا ایک تخلیقی ذہن کی کارفرمائی تسلیم کیے بغیر اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

کائنات میں ایک تخلیقی ذہن کو ماننا محض ایک بے بنیاد روایت کو ماننا نہیں ہے۔ دراصل بہت سے ناگزیر نتائج ہم کو اس عقیدہ تک پہنچاتے ہیں، بے شمار علمی حقیقتیں ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم کائنات کے پیچھے ایک ذہن کی کارفرمائی تسلیم کریں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ریڈیو کی آواز ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہم کچھ لہروں کی موجودگی تسلیم کریں، حالانکہ ہم ان لہروں کو بالکل نہیں دیکھتے۔ گلاس میں شکر ڈالیں تو تھوڑی دیر میں وہ اس طرح گھل مل جائے گی کہ آنکھوں کو دکھائی نہیں دے گی۔ مگر زبان سے چکھ کر آپ پانی میں شکر کی موجودگی کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا آنکھوں کو نظر نہیں آتا مگر جب ہم اپنے گردوپیش کی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا وجدان (intuition) پکار اٹھتا ہے کہ بے شک یہاں ایک خدا ہے، اس کے بغیر موجودہ کائنات وجود میں نہیں آسکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کے اضافے نے انسان کو خدا سے دور نہیں کیا بلکہ اور اس کے قریب کیا ہے۔ خدا کے وجود پر شک کرنا محض اپنی جہالت کا اعلان کرنا ہے۔ پاسچر کا قول کس قدر صحیح ہے جس کو مصنف نے کتاب کے صفحہ اول پر درج کیا ہے:

A smattering of science turns people away from God—Much of it brings them back to Him.

معمولی علم آدمی کو خدا سے دور کرتا ہے، زیادہ علم اس کو خدا سے قریب کرنے والا ہے۔

حادثہ، توجیہہ کے لیے کافی نہیں

Predictable Universe

اپنی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' (God Arises) میں نے 1964 میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا تھا کہ یہ کائنات بے حد بامعنیٰ کائنات ہے۔ ایسی بامعنیٰ کائنات کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس میں جو باتیں درج تھیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی:

> ''11 اگست 1999ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا جاسکے گا:
>
> On August 11, 1999, there will be a Solar eclipse that will be completely visible at Cornwall". (p. 99)

میں نے یہ بات 11 اگست 1999 سے 35 سال پہلے لکھی تھی۔ اس تحریر کے 35 سال بعد جب 11 اگست 1999 کی تاریخ آئی تو اس پیشگی بیان کے عَین مطابق ٹھیک مقرّرہ وقت پر سورج گرہن ہوا۔ اِس کے واقع ہونے میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں ہُوا۔

میں نے یہ بات بطور خود نہیں لکھی تھی، بلکہ وہ علمائے فلکیات کے حسابات (calculations) کی بنیاد پر لکھی تھی۔ علمائے فلکیات پیشگی طور پَر اتنا صحیح اندازہ کرنے میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ کائنات انتہائی محکم قوانین پر چل رہی ہے۔ کروروں سال گزرنے پر بھی اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ اِسی دریافت کی بنا پر ایک سائنس داں (سر جیمس جینز) نے اپنی کتاب ''مسٹیر یس یُونیوَرس'' میں لکھا ہے: کائنات کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا ایک ریاضیاتی دماغ (Mathematical Mind) ہے۔

کسی چیز کے بامعنیٰ ہونے کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ وہ قابلِ پیشین گوئی یا قابلُ التَّنَبُّو (predictable) ہو۔ یہ صفت موجودہ کائنات میں مکمل طور پَر موجود ہے۔ جس کا ایک ثبوت اوپر کی

مثال میں نظر آتا ہے۔

جولوگ خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ موجودہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ (accident) کے طور پر وجود میں آئی ہے، نہ کہ کسی خالق کے ارادے کے تحت۔ یہ جملہ گریمر کے اعتبار سے درست ہے۔ مگر حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ درست نہیں۔ اگر یہ مانا جائے کہ موجودہ بامعنیٰ کائنات ایک حادثے کے طور پر ظہور میں آئی ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بے شعور حادثہ بھی ایک ایسا عامل ہے، جو بامعنیٰ چیز کو وجود میں لاسکتا ہے۔ ایسی حالت میں حادثے کو لازمی طَور پَر قابلِ تکرار (repeatable) ہونا چاہیے۔ اُس کو بار بار وقوع میں آنا چاہیے۔ جس طرح بے شعور حادثے نے ایک بار ایک بامعنیٰ کائنات بنائی، اسی طرح دوبارہ ایسا ہونا چاہیے کہ حادثات کے ذریعے کوئی بامعنی چیز وجود میں آجائے۔

مگر جیسا کہ معلوم ہے، دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ سائنسی اندازے کے مطابق، موجودہ کائنات کی عمر تقریباً 13.8 بلین سال ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اس لمبے عرصے میں کوئی بامعنیٰ کائنات استثنائی طور پر صرف ایک بار وجود میں آئی، اس کے بعد کبھی نہیں، حتیٰ کہ جُزئی طور پر بھی نہیں۔ مثلاً ایسا نہیں ہُوا کہ دوبارہ کوئی نیا شمسی نظام بن جائے، دوبارہ کسی سیّارے پَر پانی اور ہَوا اَور سبزہ جیسی چیزیں وجود میں آجائیں، دوبارہ کوئی ایسی زمین بن جائے جہاں انسان اور حیوان پیدا ہو کر چلنے پھرنے لگیں۔ یہ استثناء واضح طور پر ارادی تخلیق کا ثبوت ہے۔

تمام انسانی عُلوم کے مطابق، موجودہ دنیا کامل طور پر ایک استثنائی واقعہ ہے۔ وہ تاریخِ موجودات میں ایک نادر استثنا ہے۔ کائنات کا استثنا ہونا منکرین خدا کے مذکورہ نظریے کی یقینی تردید ہے۔ کائنات اگر صرف ایک حادثے کا ظہور ہوتی تو یقینی طور پر وہ قابلِ تکرار ہوتی، اور جب وہ قابلِ تکرار نہیں تو حادثے کی اصطلاح میں اس کی توجیہہ کرنا بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ ایسی توجیہہ علمی طور پر قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا وجود اتنا ہی یقینی ہے، جتنا کہ کسی انسان کے لیے خود اُس کا اپنا وجود۔

کوئی شخص اگر اپنے وجود کو مانتا ہے تو ٹھیک اسی دلیل سے اُس کو خدا کے وجود کو بھی ماننا پڑے گا۔ اپنے وجود کو ماننا اور خدا کے وجود کو نہ ماننا ایک فکری تضاد ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ آدمی اس فکری تضاد کا تحمل نہیں کرسکتا۔

سترہویں صدی کے مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (René Descartes [1596-1650]) نے کہا تھا: ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں:

"I think, therefore I exist."

یہ اصول بلا شبہ ایک محکم اصول ہے۔ اس اصول کے مطابق، خود شناسی (self realization) آدمی کو خدا شناسی (God realization) تک پہنچاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق، یہ کہنا درست ہوگا کہ ''میرا وجود ہے، اس لیے خدا کا وجود بھی ہے'':

I exist, therefore God exists.

کائنات کا قابلِ تکرار نہ ہونا واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کو ایک باشعور وجود نے اپنے ارادے کے تحت بنایا ہے۔ اس طرح پوری کائنات میں زمین ایک نادر استثنا ہے۔ لائف سپورٹ سسٹم جو زمین پَر موجود ہے وہ وسیع کائنات میں کہیں بھی موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب پہلا انسان چاند پر گیا، اور وہاں یہ دیکھا کہ چاند ایک خشک چٹان کے سوا اور کچھ نہیں تو اس کا یہ حال ہُوا کہ جب وہ دوبارہ زمین پر اُترا تو وہ جذباتی ہجوم کے تحت زمین کے اوپر سجدے میں گر پڑا۔ کیوں کہ اُس نے زمین جیسی کوئی موافقِ حیات (pro-life) چیز خَلا میں کہیں اور نہیں دیکھی۔ خدا ایک ثابت شدہ وجود ہے، خدا کو ماننا ایک ثابت شدہ چیز کو ماننا ہے، اور خدا کا انکار کرنا ایک ثابت شدہ چیز کا انکار کرنا۔

سائنس اور الٰہیات

پروفیسر پال ڈیویز(Paul Davies) مشہور امریکی رائٹر ہیں۔ وہ ایری زونا اسٹیٹ (Arizona State) یونیورسٹی میں ایک ریسرچ سنٹر بیانڈ(Beyond) کے ڈائریکٹر ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام گولڈی لاکس انگما(Goldilocks Enigma) ہے۔ حال میں ان کا ایک مقالہ گارجین(Guardian Newspapers Limited 2007) میں چھپا ہے۔ اِس مقالے کو انگریزی اخبار ہندو(The Hindu) نے اپنے شمارہ 27 جون 2007 میں اِس عنوان کے تحت شائع کیا ہے— تخلیق پسندوں کے استدلال میں دراڑ:

Flaw in creationists' argument

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ''سائنس داں دھیرے دھیرے ایک ناگوار سچائی (inconvenient truth) تک پہنچ رہے ہیں، وہ یہ کہ کائنات ایک نہایت محکم کائنات ہے۔ سائنس داں چالیس سال سے کائنات میں کام کرنے والے قوانینِ طبیعی کی تحقیق کررہے ہیں۔ یہ تحقیق، کائنات کے پیچھے ایک شعوری وجود (conscious being) کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ کائنات کے قوانین میں سے کسی ایک کو بھی اگر بدلا جائے تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا۔ کائنات اتنی زیادہ منظم ہے کہ اس کے موجودہ ڈھانچے میں معمولی تبدیلی بھی اس کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ساری کائنات ایٹم سے بنی ہے۔ اور ہر ایٹم نیوٹران اور پروٹان کا مجموعہ ہے۔ نیوٹران کسی قدر وزنی ہوتا ہے، اور پروٹان کسی قدر ہلکا۔ یہ تناسب بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا الٹا ہو، یعنی پروٹان بھاری ہو اور نیوٹران ہلکا، تو معلوم قوانین کے مطابق، ایٹم کا وجود ہی نہ رہے گا۔ جب نیوکلیس نہ ہوگا تو ایٹم بھی نہ ہوگا، اور جب ایٹم نہ ہوگا تو کیمسٹری بھی نہیں ہوگی، اور جب کیمسٹری نہیں ہوگی تو زندگی بھی نہیں ہوگی۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ سائنس ناقابلِ حل سوالات سے دوچار ہے۔ مثلاً طبیعیات

کے موجودہ قوانین کہاں سے آئے، وہ اپنی موجودہ محکم حالت میں کیوں قائم ہیں، وغیرہ۔ روایتی طور پر سائنس داں یہ فرض کررہے تھے کہ یہ قوانین، کائنات کا لازمی حصہ ہیں۔ قوانینِ طبیعی کی حقیقت کی کھوج کرنا، سائنس کا موضوع نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب یہ سوالات سائنس دانوں کو پریشان کررہے ہیں۔

کیمبرج کے سائنس داں مارٹن ریس (Martin John Rees [b. 1942]) جو کہ 'رائل ایسٹرونومیکل سوسائٹی' کے صدر رہ چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طبیعیات کے قوانین، مطلق اور آفاقی نہیں ہیں، وہ ایک بڑے کائناتی نظام کے متفرق حصے ہیں۔ ہر حصے کے اپنے ضوابط ہیں۔ وہ اِس نظام کو متعدّد کائناتی نظام (the multiverse system) کہتے ہیں۔ اِن تحقیقات کے مطابق، ہماری کائنات ایک ایسی کائنات ہے، جو موافقِ حیات قوانین (bio-friendly laws) کی حامل ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات کو ہم اِس طرح پاتے ہیں کہ وہ ہماری ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں انسان کا قیام ناممکن ہوجاتا۔ یہ محکم قوانین جو کائنات کو نہایت منظم طور پر کنٹرول کررہے ہیں، وہ کہاں سے آئے۔

تمام مشکلات کا سبب، جدید مفکرین کے نزدیک، یہ ہے کہ مذہب اور جدید سائنس، دونوں کائنات کا جو تصور دے رہے ہیں، وہ کائنات کے علاوہ ایک ایسی ایجنسی کا تقاضا کرتے ہیں، جو کائنات کے باہر سے کائنات کا نظم کررہی ہو۔ تاہم کائنات کی توجیہہ کے لیے ایک ایسے ڈزائنر کو ماننا جو کائنات سے پہلے موجود ہو، وہ اِس مسئلے کی کوئی توجیہہ نہیں۔ کیوں کہ یہ توجیہہ فوراً یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ ڈزائنر نے اگر کائنات کو بنایا تو خود ڈزائنر کو کس نے بنایا:

Who designed the designer

اگر زندگی کی کوئی آخری معنویت (ultimate meaning) ہے، جیسا کہ میں یقین رکھتا ہوں، تو یہ جواب خود نیچر کے اندر ملنا چاہیے، نہ کہ اُس سے باہر۔ کائنات ایک محکم کائنات ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو کائنات نے خود ہی اپنے آپ کو ایسا بنایا ہے''۔

وضاحت

الٰہیات کے معاملے میں جدید ذہن سخت کنفیوژن کا شکار رہے۔ اِس کا ایک اندازہ پروفیسر پال ڈیویز کے مذکورہ مضمون سے ہوتا ہے۔ملحد فلاسفہ اکثر یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا نے کائنات کو بنایا تو خود خدا کو کس نے بنایا۔مگر یہ سوال مکمل طور پر ایک غیر منطقی (illogical) سوال ہے۔ یہ منطق (logic) کی نفی ہے۔مزید یہ کہ مذکورہ اعتراض ایک کُھلی تضاد فکری پر قائم ہے۔ یہ لوگ خود تو کائنات کو بغیر خالق کے مان رہے ہیں، مگر خالق کو ماننے کے لیے وہ ایک خالق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ کائنات کا وجود اگر بغیر خالق کے ممکن ہے تو خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ممکن ہونا چاہیے۔

عقلی موقف

خدا کے وجود کے معاملے میں اصل غور طلب بات یہ ہے کہ خالص عقلی نقطۂ نظر سے ہم کیا موقف اختیار کر سکتے ہیں، اور کیا نہیں۔ اِس کے سوا کوئی اور طریقہ اِس معاملے میں سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ یہ ایک مسلّم بات ہے کہ کائنات میں انتہائی معیاری حد تک نظم پایا جاتا ہے۔نظم کا یہ معاملہ ہر آدمی کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ مذکورہ مضمون نگار نے ایٹم کی ساخت کو لے کر اِسی معاملے کی ایک سائنسی مثال دی ہے۔ اِس لیے جہاں تک کائنات میں نظم کا سوال ہے، یہ ہر فریق کے نزدیک، ایک مسلّم حقیقت ہے۔

عقلی موقف کے اعتبار سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظم کا تصور ناظم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جہاں نظم ہے، وہاں یقینا اس کا ایک ناظم موجود ہے۔ ناظم کے بغیر نظم کا تصور عقلی اعتبار سے محال ہے۔نظم کی موجودگی ایک مجبورانہ منطق (compulsive logic) پیدا کرتی ہے، یعنی کسی بھی عذر کے بغیر ناظم کی موجودگی کا اقرار کرنا۔ کسی کے ذہن میں ناظم کی موجودگی کی توجیہہ نہ ہونا، اُس کو یہ منطقی جواز نہیں دیتا کہ وہ ناظم کی موجودگی کا انکار کردے۔

ایٹم کے ڈھانچے کی مثال لے کر مضمون نگار نے جو بات کہی ہے، وہی اِس دنیا کی ہر چیز کے

بارے میں درست ہے۔ اِس دنیا کا ہر جُز، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، وہ اِس قدر محکم اور متناسب ہے کہ اس کے ڈھانچے میں کوئی بھی تغیر سارے نظام عالم کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سیارۂ زمین میں جو کشش (gravity) ہے، وہ آخری حد تک ہماری ضرورتوں کے مطابق ہے۔ اگر زمین کی کشش نصف کے بقدر زیادہ ہوجائے، یا نصف کے بقدر کم ہوجائے تو دونوں حالتوں میں سیارۂ زمین پر انسانی تہذیب کا بقا ناممکن ہوجائے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خلا میں ہمارے دو قریبی پڑوسی ہیں— سورج اور چاند۔ اگر ایسا ہو کہ سورج وہاں ہو جہاں آج چاند ہے، اور چاند وہاں ہو جہاں آج سورج ہے، تو زمین پر انسانی زندگی تو درکنار خود زمین جل کر ختم ہوجائے گی۔

ہماری زمین پر تمام چیزیں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں۔ لیکن درخت کا معاملہ استثنائی طور پر یہ ہے کہ اس کی جڑیں تو زمین میں نیچے کی طرف جاتی ہیں اور اس کا تنا اوپر کی طرف جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ درخت میں یہ دوطرفہ خصوصیت نہ ہو تو اس کے بعد زمین کی سطح پر ہرے بھرے درختوں کا خاتمہ ہوجائے گا، وغیرہ۔

ذہین کائنات

کائنات میں اَن گنت چیزیں ہیں، اور ہر چیز مرکّب (compound) کی صورت میں ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایٹم، کائنات کا ایک ایسا واحدہ ہے، جو مفرد (single) ہے، اور غیر مرکب حالت میں ہے۔ مگر آئن سٹائن کے زمانے میں جب ایٹم ٹوٹ گیا تو معلوم ہوا کہ اٹیم بھی مرکب ہے، وہ کوئی مفرد چیز نہیں۔

دورِ جدید میں ہر چیز کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ چیزیں جن اشیا سے ترکیب پا کر بنتی ہیں، ان کی ترکیب کے لیے ہمیشہ بہت سے آپشن (options) موجود ہوتے ہیں، مگر سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ نیچر ہمیشہ یہ کرتی ہے کہ بہت سے آپشن میں سے اُسی ایک آپشن کو لیتی ہے، جو کائنات کی مجموعی اسکیم کے عین مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز

بالکل پرفیکٹ نظر آتی ہے، اِس دنیا کی ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔

یہ اصول جو کائنات میں رائج ہے، اُس کو ایک لفظ میں ذہین انتخاب (intelligent selection) کہہ سکتے ہیں۔ کائنات میں بلین، ٹریلین سے بھی زیادہ چیزیں موجود ہیں، لیکن ہر چیز بلا استثنا، اِسی ذہین انتخاب کی مثال ہے۔ یہ اصول اتنا زیادہ عام ہے کہ ایک سائنس داں ڈاکٹر فریڈ ہائل (Fred Hoyle) نے اِسی موضوع پر ایک کتاب تیار کرکے شائع کی ہے، اُس کا نام ہے— ذہین کائنات (The Intelligent Universe)۔ یہ کتاب ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے، اور 1983 میں لندن سے چھپی ہے۔

کائنات کا یہ ظاہرہ (phenomenon) کوئی سادہ بات نہیں، وہ خدا کے وجود کا ایک حتمی ثبوت ہے۔ کائنات کی بناوٹ میں ذہانت (intelligence) کی موجودگی واضح طور پر ایک اور بات ثابت کرتی ہے۔ ذہین تخلیق (intelligent creation) واضح طور پر ذہین خالق (intelligent creator) کا ثبوت ہے۔ منطقی طور پر یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ یہاں ذہین عمل موجود ہو، لیکن ذہین عامل یہاں موجود نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بلا شبہ لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ذہین عمل کو ماننے کے بعد ذہین عامل کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے جیسے ایک پیچیدہ مشین کو ماننے کے بعد اُس کے انجینئر کو نہ ماننا۔ ڈاکٹر فریڈ ہائل نے اپنی کتاب میں درست طور پر لکھا ہے کہ سائنس کے ابتدائی دور میں مسیحی چرچ نے سائنس دانوں کے خلاف جو متشددانہ کارروائی کی، وہ ابھی تک لوگوں کو یاد ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر وہ یہ اعلان کردیں کہ کائنات کے پیچھے ایک ذہین خالق کے وجود کا ثبوت مل رہا ہے تو قدیم مذہبی تشدد (religious connotation) شاید دوبارہ واپس آجائے گا۔ مگر یہ ایک بے بنیاد خوف ہے۔ ذہین خالق کے سائنسی اعتراف کے بعد جو چیز تاریخ میں واپس آئے گی، وہ سچا خدائی مذہب ہے، نہ کہ مسیحی چرچ۔

دو انتخاب (options)

کائنات میں جو غیر معمولی نظم اور تناسب پایا جاتا ہے، اس کی توجیہہ کے لیے ہمارے پاس دو

انتخاب(options) ہیں۔ایک، یہ کہ کائنات اپنی ناظم آپ ہے۔مگر سائنس کی تمام تحقیقات اِس کی تردید کرتی ہیں۔ اِس لیے کہ سائنس نے کائنات میں جس نظم کو دریافت کیا ہے، وہ مکمل طور پر ایک ذہین نظم(intelligent design) ہے۔دوسری طرف سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ خود کائنات کے اندر سب کچھ ہے،لیکن وہی چیز اس کے اندر موجود نہیں،جس کو ذہانت(intelligence) کہا جاتا ہے۔سائنس کی دریافت کردہ کائنات، بیک وقت کامل طور پر منظم(designed) ہے،اوراسی کے ساتھ وہ کامل طور پر غیر ذہین(non-intelligent) ہے۔ایسی حالت میں کائنات کو اپنے نظم کا خود ناظم سمجھنا، ایسا ہی ہے جیسے پتھر کے اسٹیچو کے بارے میں یہ فرض کرلیا جائے کہ اس نے اپنی بامعنیٰ ڈزائن خود تیار کی ہے۔وہ ایک خود تخلیقی وجود(self-created being) ہے۔

اِس کے بعد ہمارے پاس کائنات کی توجیہہ کے لیے صرف ایک آپشن باقی رہتا ہے،اور وہ یہ کہ ہم ایک خارجی ایجنسی(outside agency) کو کائنات کے نظم کا سبب قرار دیں۔ اِس ایک انتخاب کے سوا، کوئی دوسرا انتخاب ہمارے لیے عملی طور پر ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہمارے لیے بے خدا کائنات اور باخدا کائنات کے درمیان انتخاب نہیں ہے، بلکہ باخدا کائنات(universe with God)اورغیر موجود کائنات (no universe at all) کے درمیان انتخاب ہے۔یعنی ہم اگر خدا کا انکار کریں تو ہمیں کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کرسکتے، اِس لیے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کے وجود کو تسلیم کریں۔

واحد انتخاب

عقلی اصولوں میں سے یہ ایک اصول ہے کہ جب ایسی صورتِ حال ہو کہ عملی طور پر ہمارے لیے صرف ایک ہی انتخاب ممکن ہو تو اُس وقت ہمارے لیے ایک مجبور کن صورتِ حال (compulsive situation) پیدا ہوجاتی ہے،یعنی ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اُس ایک انتخاب کو لے لیں۔ اِس کے خلاف کرنا، صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ وہاں ایک سے زیادہ انتخاب موجود ہوں۔لیکن

جب ایک کے سوا کوئی دوسرا انتخاب سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اُس وقت لازم ہوجاتا ہے کہ ہم اِسی واحد انتخاب کو قبول کرلیں۔ زیرِ بحث مسئلے میں یہ واحد انتخاب خدا کے وجود کو بطور واقعہ تسلیم کرنا ہے، کیوں کہ یہاں اقرارِ خدا کے سوا کوئی اور انتخاب ہمارے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔

منطقی استدلال

کسی بات کو عقلی طور پر سمجھنے کے لیے انسان کے پاس سب سے بڑی چیز منطق (logic) ہے۔ منطق کے ذریعے کسی بات کو عقلی طور پر قابلِ فہم بنایا جاتا ہے۔ منطق کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک ہے، انتخابی منطق (optional logic) اور دوسری ہے، مجبورانہ منطق (compulsive logic)۔ منطق کے یہ دونوں ہی طریقے یکساں طور پر قابلِ اعتماد ذریعے ہیں۔ دونوں میں سے جس ذریعے سے بھی بات ثابت ہوجائے، اس کو ثابت شدہ مانا جائے گا۔

انتخابی منطق

انتخابی منطق وہ ہے جس میں آدمی کے لیے کئی میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع ہو۔ اِس قسم کے معاملے میں ہمارے پاس ایسے ذریعے ہوتے ہیں، جن کو اپلائی کرکے ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ کئی میں سے صرف ایک کا انتخاب کریں، اور بقیہ کو چھوڑ دیں۔

مثلاً سورج کی روشنی کو لیجیے۔ آنکھ سے دیکھنے میں سورج کی روشنی صرف ایک رنگ کی دکھائی دیتی ہے، لیکن پرزم (prism) سے دیکھنے میں سورج کی روشنی سات رنگوں میں بٹ جاتی ہے۔ اِس طرح سورج کی روشنی کے رنگ کے بارے میں ہمارے پاس دو انتخاب (options) ہو گئے۔ اب ہمارے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ دونوں میں سے جس انتخاب میں منطقی وزن زیادہ ہو، ہم اس کو لیں۔ چنانچہ اِس معاملے میں سات رنگوں کے نظریے کو مان لیا گیا۔ کیوں کہ وہ زیادہ قوی ذریعے سے ثابت ہورہا تھا۔

مجبورانہ منطق

مجبورانہ منطق کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ مجبورانہ منطق میں آدمی کے پاس صرف ایک کا

انتخاب(option) ہوتا ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اُس ایک انتخاب کو تسلیم کرے۔ کیوں کہ اس میں ایک کے سوا کوئی اور انتخاب سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مجبورانہ منطق کے معاملے میں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو لازمی طور پر ماننا بھی ہے، اور ماننے کے لیے اس کے پاس ایک انتخاب کے سوا کوئی دوسرا انتخاب موجود نہیں۔

مجبورانہ منطق کی ایک قریبی مثال ماں کی مثال ہے۔ ہر آدمی کسی خاتون کو اپنی ماں ماننا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ ایک خاتون کو اپنی ماں تسلیم کرے۔ حالاں کہ اُس نے اپنے آپ کو اُس خاتون کے بطن سے پیدا ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اِس کے باوجود وہ اپنی ماں کو یقین کے ساتھ ماں مانتا ہے۔ یہ ماننا، مجبورانہ منطق کے اصول کے تحت ہوتا ہے۔ ایسا وہ اِس لیے کرتا ہے کہ اِس معاملے میں اُس کی پوزیشن یہ ہے کہ اس کو ایک خاتون کو ہر حال میں اپنی ماں ماننا ہے۔ اِسی لیے وہ اپنی ماں کو یقین کے ساتھ اپنی ماں تسلیم کرلیتا ہے۔ کیوں کہ اِس کیس میں اُس کے لیے کوئی دوسرا انتخاب(option) موجود نہیں۔

خدا کے وجود کو ماننے کا تعلق بھی اِسی قسم کی مجبورانہ منطق سے ہے۔ خدا کے وجود کے پہلو سے اصل قابلِ غور بات یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہمارے لیے کوئی دوسرا انتخاب ہی نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو مانیں۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں کائنات کے وجود کی، اور خود اپنے وجود کی نفی کرنی پڑے گی۔ چوں کہ ہم اپنی اور کائنات کے وجود کی نفی نہیں کرسکتے، اِس لیے ہم خدا کے وجود کی بھی نفی نہیں کرسکتے۔

انسان کا وجود، خدا کے وجود کا ثبوت

وسیع کائنات میں صرف انسان ہے، جو خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ حالاں کہ انسان کا خود اپنا وجود، خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اگر انسان جیسی ایک ہستی یہاں موجود ہے تو خدا بھی یقینی طور پر موجود ہے۔ انسان کے اندر وہ تمام صفتیں ناقص طور پر موجود ہیں، جو خدا کے اندر کامل طور پر موجود ہیں۔ اگر ناقص ہستی کا وجود ہے تو کامل ہستی کا بھی یقینی طور پر وجود ہے۔ ایک کو ماننے

کے بعد دوسرے کو نہ ماننا، ایک ایسا منطقی تضاد ہے، جس کا تحمل کوئی بھی صاحبِ عقل نہیں کرسکتا۔

ڈیکارٹ (Rene Descartes) مشہور فرنچ فلسفی ہے۔ وہ 1596 میں پیدا ہوا، اور 1650 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ انسان اگر موجود ہے تو اس کی موجودگی کا عقلی ثبوت کیا ہے۔ لمبے غور وفکر کے بعد اس نے اس سوال کا جواب اِن الفاظ میں دیا— میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں :

I think, therefore I exist.

ڈیکارٹ کا یہ جواب منطقی اعتبار سے ایک محکم جواب ہے۔ مگر یہ منطق، جس سے انسان کا وجود ثابت ہوتا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات کو ثابت کررہی ہے، اور وہ ہے خدا کے وجود کا عقلی ثبوت۔ اِس منطقی اصول کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا— سوچ کا وجود ہے، اِس لیے خدا کا بھی وجود ہے:

Thinking exists, therefore God exists.

سوچ ایک مجرد (abstract) چیز ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ اِسی لیے خدا کا انکار کرتے ہیں کہ خدا انھیں ایک مجرد تصور معلوم ہوتا ہے، اور مجرد تصور کی موجودگی ان کے لیے ناقابلِ فہم ہے، یعنی ایک ایسی چیز کو ماننا جس کا کوئی مادّی وجود نہ ہو۔ لیکن ہر انسان سوچنے والی مخلوق ہے۔ خود اپنے تجربے کی بنیاد پر ہر آدمی سوچ کے وجود کو مانتا ہے۔ حالاں کہ سوچ مکمل طور پر ایک مجرد تصور ہے، یعنی ایک ایسی چیز جس کا کوئی مادّی وجود نہیں۔

اب اگر انسان ایک قسم کے مجرد تصور کے وجود کو مانتا ہے تو اُس پر لازم آجاتا ہے کہ وہ دوسری قسم کے مجرد تصور کے وجود کو بھی تسلیم کرے۔ یہ بلاشبہ خدا کے وجود کا ایک ایسا ثبوت ہے، جس کا تجربہ ہر آدمی کرتا ہے، اور جس کی صحت کو ہر آدمی بلا اختلاف مانتا ہے۔ اگر سوچ کے وجود کا انکار کردیا جائے تو اس کے بعد یقینی طور پر انسان کے وجود کا اور خود اپنے وجود کا انکار کرنا پڑے گا۔ کوئی بھی آدمی اپنے وجود کا انکار نہیں کرسکتا، اس لیے کسی بھی آدمی کے لیے منطقی طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا

کے وجود کا انکار کرے۔

خدا کا غیر مرئی (invisible) ہونا، اِس بات کے لیے کافی نہیں کہ خدا کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مرئی ہونے کی بنا پر خدا کے وجود کا انکار کرنا، ماڈرن سائنس کے زمانے میں ایک خلافِ زمانہ استدلال (anachronistic argument) ہے۔ اس لیے کہ آئن سٹائن (وفات 1955) کے زمانے میں جب ایٹم ٹوٹ گیا، اور علم کا دریا عالم صغیر (microworld) تک پہنچ گیا تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ہر چیز غیر مرئی ہے۔ پہلے جو چیزیں مرئی (visible) سمجھی جاتی تھیں، اب وہ سب کی سب غیر مرئی (invisible) ہوگئیں۔ ایسی حالت میں عدم رُویت کی بنیاد پر خدا کے وجود کا انکار کرنا، ایک غیر علمی موقف بن چکا ہے۔ اس موضوع کی تفصیل کے لیے حسب ذیل دو کتابوں کا مطالعہ کافی ہے:

Science and the Unseen World, by Sir Arthur Eddington

Human Knowledge, by A. W. Bertrand Russel

خلائی مشاہدہ

موجودہ زمانے میں جو نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں، اُن میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو خلائی سفر کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ راکٹ کے ذریعے خَلا میں گئے، اور وہاں سے مخصوص دوربینوں کے ذریعے انھوں نے زمین کا مطالعہ کیا۔ اِن لوگوں نے اپنے خلائی مشاہدے کی بنیاد پر بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں۔

اُن میں سے ایک بات یہ ہے کہ ایک خلاباز نے کہا کہ خلائی سفر کے دوران انھوں نے یہ تجربہ کیا کہ وسیع خلا میں کہیں بھی زمین جیسا کوئی کُرہ موجود نہیں۔ زمین پر لائف ہے، اور اُسی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر لائف سپورٹ سسٹم (life-support system) بھی۔ یہ دونوں چیزیں زمین پر انتہائی موزوں اور متناسب انداز میں پائی جاتی ہیں۔ ایک خلاباز نے زمین کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا — صحیح قسم کا سامان صحیح جگہ پر:

Right type of material at the right place.

زمین کی یہ انوکھی صفت ہے کہ یہاں زندگی پائی جاتی ہے، یہاں چلتا پھرتا انسان موجود ہے، مگر اِس قسم کی زندگی کی موجودگی کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کے لیے دوسرے اَن گنت اسباب درکار ہیں۔ اِن اسباب کے بغیر زندگی کا وجود اور بقا ممکن نہیں۔ زمین، اِس اعتبار سے وسیع کائنات میں ایک انوکھا استثنا ہے۔ یہاں استثنائی طور پر انسان موجود ہے اوراسی کے ساتھ یہاں اس کے وجود اور بقا کے لیے انتہائی متناسب انداز میں تمام سامانِ حیات موجود ہے۔

وسیع کائنات میں یہ بامعنیٰ استثنا بلا شبہ ارادی عمل اور منصوبہ بند تخلیق کا ثبوت ہے، اور جہاں ارادی عمل اور منصوبہ بند تخلیق کا ثبوت موجود ہو، وہاں ایک صاحبِ ارادہ اور ایک صاحبِ تخلیق ہستی کا وجود اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے۔

زمین ایک استثنا

ایک شخص اگر کائنات کا سفر کرکے پوری کائنات کا مشاہدہ کرے تو وہ پائے گا کہ وسیع کائنات پوری طرح ایک غیر ذی روح (lifeless) کائنات ہے۔ اُس میں اتھاہ خلا ہے، دہشت ناک تاریکی ہے، اُس کے اندر پتھر کی چٹانیں ہیں، آگ کے بہت بڑے بڑے گولے ہیں، اور یہ سب چیزیں دیوانہ وار مسلسل حرکت میں ہیں۔

اِس پُر ہیبت منظر سے گذر کر جب وہ سیارۂ زمین پر پہنچتا ہے تو یہاں اس کو ایک حیران کُن استثنا نظر آتا ہے۔ یہاں استثنائی طور پر پانی ہے، سبزہ ہے، حیوانات ہیں، زندگی ہے، عقل وفہم کے پیکر انسان ہیں، پھر یہاں حیرت ناک طور پر وہ موافقِ حیات چیز موجود ہے، جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک مکمل تہذیب (civilization) موجود ہے، جو وسیع کائنات میں کہیں بھی سرے سے موجود نہیں، یعنی بہ ظاہر ایک انتہائی بے معنی کائنات میں ایک انتہائی بامعنیٰ دنیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وسیع کائنات میں سیارۂ زمین ایک انتہائی نادر استثنا ہے۔ یہ استثنا کوئی سادہ بات نہیں، وہ ایک عظیم حقیقت کا مشاہداتی ثبوت ہے، اور وہ ہے قادرِ مطلق خدا کا ثبوت — استثنا مداخلت کو ثابت کرتا ہے اور مداخلت بلا شبہ مداخلت کار کا ثبوت ہے، اور جب مداخلت کار کا وجود

ثابت ہو جائے تو اس کے بعد خدا کا وجود اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے:

Exception proves intervention and intervention proves intervenor and when the existence of intervenor is proved, the existence of God is also proved.

سَفرِنگ کا مسئلہ

خدا کے وجود پر شک کرنے کے لیے جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو پرابلم آف اِوِل (problem of evil) یا سفرنگ (suffering) کہا جاتا ہے۔ یہ اعتراض صرف ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے، وہ یہ کہ انسانی زندگی میں جو سفرنگ ہے، وہ تمام ترین میڈ (man-made) ہے، مگر اس کو غلط طور پر گاڈ میڈ (God-made) سمجھ لیا گیا ہے۔ انسانی زندگی میں سفرنگ کے حوالے سے جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ اِسی غلط انتساب کا نتیجہ ہے۔

اِس غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگ جب کسی انسان کی زندگی میں سفرنگ (suffering) کے واقعے کو دیکھتے ہیں تو وہ اُسی مبتلا انسان کے حوالے سے اُس کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ چوں کہ اکثر مثالوں میں خود اُسی مبتلا انسان کے اندر اس کی توجیہہ نہیں ملتی، اس لیے اس سفرنگ کو لے کر وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ یا تو اس دنیا کا کوئی خدا نہیں، یا اگر خدا ہے تو وہ ظالم اور غیر منصف خدا ہے، مگر یہ انتساب بجائے خود غلط ہے۔

انسان کی زندگی میں جو سفرنگ پیش آتی ہے، اس کا سبب کبھی انسان خود ہوتا ہے اور کبھی اس کے والدین ہوتے ہیں اور کبھی اس کا سبب وہ سماج ہوتا ہے جس میں وہ رہ رہا ہے اور کبھی وسیع تر معنوں میں اجتماعی نظام اُس کا ذمے دار ہوتا ہے۔ اِسی کے ساتھ کبھی کوئی سفرنگ فوری سبب سے پیش آتی ہے اور کبھی اس کے اسباب پیچھے کئی پشتوں تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

غلط ریفرنس میں مطالعہ

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ شبہے کا سبب، اصل صورتِ حال کا غلط ریفرنس میں مطالعہ ہے، یعنی جس ظاہرے (phenomenon) کو انسان کی نسبت سے دیکھنا چاہیے، اُس کو خدا کی نسبت سے

دیکھنا۔ حالاں کہ یہ سائنسی حقائق کے سرتاسر خلاف ہے۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں ایڈز (AIDS) کا مسئلہ ایک خطرناک مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر خود طبّی تحقیق کے مطابق، یہ انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ میڈیکل سائنس میں یہ مستقل نظریہ ہے کہ کئی بیماریاں اَجداد سے نسلی طور پر منتقل ہوتی ہیں۔ ایسی بیماریوں کو اجدادی بیماری (atavistic disease) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح مختلف قسم کی وبائیں پھیلتی ہیں، جس میں ہزاروں لوگ مرجاتے ہیں، یا خرابیٔ صحت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی خود طبی تحقیق کے مطابق، انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

دہلی میں معروف شخصیت ڈاکٹر اَرُن شوری کے صاحب زادے مفلوج ہو کر وھیل چیئر پر رہتے ہے۔ اِس ''سفرنگ'' کا سبب بھی یہ ہے کہ چھوٹی عمر میں امریکا کے ایک اسپتال میں اُن کو غلط انجکشن لگ گیا، اِس بنا پر وہ جسمانی اعتبار سے مفلوج ہوگئے۔ اِسی طرح تشدد اور جنگوں کے نتیجے میں بے شمار لوگ مرجاتے ہیں یا ناکارہ ہوجاتے ہیں، یہ سب بھی انسانی کارروائیوں کی بنا پر ہوتا ہے، وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی سفرنگ کو نیچر سے منسوب کرنا، سرتاسر ایک غیر علمی بات ہے۔ سائنس کی تمام شاخوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نیچر مکمل طور پر خرابیوں سے پاک ہے۔ نیچر اِس حد تک محکم ہے کہ اس کی کارکردگی کے بارے میں پیشگی طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر نیچر کے اندر قابل پیشین گوئی کردار نہ ہوتو سائنس کی تمام سرگرمیاں اچانک ختم ہوجائیں گی۔

تقابلی مطالعہ

پرابلم آف اِوِل کے اِس معاملے کا علمی مطالعہ کرنے کا پہلا اصول وہ ہے، جس کو تقابلی طور پر سمجھنا (it is in comparison that we understand) کہا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ محدود طور پر صرف انسانی دنیا کا مسئلہ ہے، جب کہ انسان پوری کائنات کے مقابلے میں ایک بہت ہی چھوٹے جُز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقیہ کائنات اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مکمل طور پر

ایک بے نقص کائنات (zero-defect universe) ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہر آن جاری رہتی ہیں، لیکن اُس میں کہیں بھی کوئی خرابی (evil) دکھائی نہیں دیتی۔

انسانی دنیا میں بیماریاں ہیں، انسانی دنیا میں حادثات ہیں، انسانی دنیا میں ظلم ہے، انسانی دنیا میں کرپشن ہے، انسانی دنیا میں بے انصافی ہے، انسانی دنیا میں استحصال ہے، انسانی دنیا میں لڑائیاں ہیں، انسانی دنیا میں نفرت اور دشمنی ہے، انسانی دنیا میں سرکشی ہے، انسانی دنیا میں فسادات ہیں، انسانی دنیا میں جرائم ہیں، اِس قسم کی بہت سی برائیاں انسانی دنیا میں پائی جاتی ہیں، لیکن انسان کے سوا، بقیہ کائنات اِس قسم کی برائیوں سے مکمل طور پر خالی ہے۔ یہی فرق یہ ثابت کرتا ہے کہ بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) خود انسان کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ فطرت کا پیدا کردہ۔ اگر یہ مسئلہ فطرت کا پیدا کردہ مسئلہ ہوتا تو وہ بلاشبہ پوری کائنات میں پایا جاتا۔

سائنٹفک مطالعہ

اس معاملے کا سائنٹفک مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانی دنیا اور بقیہ کائنات میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ بقیہ کائنات حتمی قسم کے قوانینِ فطرت سے کنٹرول ہورہی ہے۔ اِس کے برعکس، انسان آزاد ہے اور وہ خود اپنی آزادی سے اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ یہی فرق دراصل اُس چیز کا اصل سبب ہے، جس کو بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

اِس معاملے کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانی دنیا کی تمام بُرائیاں، انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔ میڈیکل سائنس بتاتی ہے کہ بیماریوں کا سبب نیچر میں نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی اپنی غلطیوں میں ہے۔ یہ غلطیاں کبھی مبتلا شخص کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں، کبھی باپ دادا کی وراثت اس کا سبب ہوتی ہے، کبھی اجتماعی نظام کا کرپشن بیماریوں کے اسباب پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بے حد قابلِ غور ہے کہ بیماری کو نیچر سے جوڑنا ملحد مفکرین کا نظریہ ہے، وہ کسی سائنٹفک دریافت پر مبنی نہیں۔ اِسی طرح لڑائیاں، گلوبل وارمنگ، مختلف قسم کی کثافت، فضائی مسائل (ecological problems) وغیرہ، سب کے سب انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔

خدا کا تخلیقی پلان

خالق نے انسان کو یہ آزادی (freedom) کیوں دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق نے چاہا کہ وہ انسان کو ایک عظیم انعام دے۔ یہ عظیم انعام جنت ہے، جو ابدی خوشیوں کی جگہ ہے۔ جنت میں جگہ پانے کا حق دار صرف وہ شخص ہوگا، جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے۔ جو آزاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ڈسپلن اور کنٹرول میں رکھے۔ جہاں آزادی ہوگی، وہاں آزادی کا غلط استعمال بھی ہوگا۔لیکن آزادی اتنی زیادہ قیمتی چیز ہے کہ کسی بھی اندیشے کی بنا پر اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کو جاننا ضروری ہے۔خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو اس دنیا میں مکمل آزادی دی گئی ہے۔ ایسا خدا نے امتحان کی مصلحت کے لیے کیا ہے۔انسانی زندگی میں سفرنگ کے جو واقعات ہوتے ہیں، وہ تمام تر اسی آزادی کے غلط استعمال کے نتیجے میں ہوتے ہیں، کبھی براہِ راست طور پر اور کبھی بالواسطہ طور پر، کبھی سفرنگ میں مبتلا شخص کے ذاتی عمل کی وجہ سے اور کبھی دوسرے انسانوں کے اعمال کی وجہ سے، کبھی کسی فوری غلطی کے نتیجے کے طور پر اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پچھلی نسلوں کی غلطی کی بنا پر اُس کا نتیجہ بعد کی نسلوں کے سامنے آتا ہے۔

کائناتی معنویت کی توجیہہ

خدا کے وجود کی بحث کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق، کائنات کی معنویت (meaningfulness) سے ہے۔خدا کو ماننا، نہ صرف کائنات کے وجود کی توجیہہ ہے، بلکہ خدا کا عقیدہ کائنات کو کامل طور پر بامعنیٰ (meaningful) بنا دیتا ہے۔خدا کو نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ بامعنیٰ کائنات ایک بے معنیٰ انجام پر ختم ہوجائے۔ جب کہ خدا کو ماننا، یہ بتا تا ہے کہ کائنات آخر کار ایک بامعنیٰ انجام پر پہنچنے والی ہے۔

انسان کے اندر پیدائشی طور پر انصاف اور بے انصافی کا تصور پایا جا تا ہے۔ انسان پیدائشی

طور پر یہ چاہتا ہے کہ جو شخص انصاف کے اصولوں کے تحت زندگی گذارے، اُس کو انعام ملے، اور جو شخص ناانصافی کا طریقہ اختیار کرے، اس کو سزا دی جائے۔ اِس فطری تقاضے کی تکمیل صرف باخدا کائنات (universe with God) کے نظریے میں ملتی ہے، بے خدا کائنات (universe without God) کے نظریے میں اِس فطری تقاضے کا کوئی جواب نہیں۔

ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر خواہشوں کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ موجودہ دنیا میں اِن خواہشوں کی تکمیل (fulfillment) ممکن نہیں۔ بے خدا کائنات کے نظریے میں انسان کے لیے یہ حسرت ناک انجام مقدر ہے کہ اس کی فطری خواہشیں کبھی پوری نہ ہوں۔ لیکن باخدا کائنات کے نظریے میں یہ امکان موجود ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں کی کامل تسکین، بعد از موت کے مرحلۂ حیات میں پالے۔

وقت کا شعور

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ٹائم کانشش مخلوق ہے۔ وہ اپنے وقت کو حال اور مستقبل میں بانٹ کر دیکھتا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں صرف حال (present) ملتا ہے۔ ہر آدمی اپنے مستقبل سے محروم ہو کر مایوسی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ وہ اپنے حال میں بہتر مستقبل کے لیے عمل کرتا ہے، لیکن اس کی محدود عمر میں اس کا وہ بہتر مستقبل اس کو نہیں ملتا اور وہ مایوسی کے ساتھ اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

ایک بار ہم نے انٹرنیٹ پر یہ تلاش کیا کہ بڑے بڑے لوگوں میں وہ کون ہیں، جو اپنی آخری عمر میں مایوسی کا شکار ہوئے اور ڈپریشن (depression) کی حالت میں مَرے۔ اِس کے جواب میں انٹرنیٹ نے جو فہرست دی، اس میں چار سو دو بڑے بڑے اشخاص کے نام موجود تھے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

Risk Factor Depression

کائنات کے باخدا نظریے میں انسان کے اِس فطری سوال کا جواب موجود ہے، لیکن کائنات

کے بے خدا نظریے میں اِس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔

زَوجین کا اصول

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہے — منفی برقی ذرّے کا جوڑا مثبت برقی ذرہ، درخت کے پھولوں میں نر اور مادہ، حیوانات میں مذکّر اور مؤنث۔ انسان میں عورت اور مرد، وغیرہ۔ یہ ایک کائناتی قانون ہے کہ یہاں ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے۔

اِس لحاظ سے انسانی زندگی کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہیے، یعنی موت سے پہلے کی نامکمل زندگی کے ساتھ موت کے بعد کی کامل زندگی۔ باخدا کائنات کے نظریے میں اُس کا یہ تکمیلی جوڑا موجود ہے، لیکن بے خدا کائنات کے نظریے میں اُس کا یہ تکمیلی جوڑا موجود نہیں۔

آئڈیل ازم کی ناکامی

تمام فلاسفہ اور مفکرین موجودہ دنیا کو ابدی (eternal) سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اِسی موجودہ عالم میں ہم کبھی نہ کبھی اپنی مطلوب دنیا بنالیں گے۔ آئڈیل سوسائٹی، آئڈیل ریاست، آئڈیل نظام کے تصورات اِسی فکر کے تحت پیدا ہوئے۔ ایسے تمام مفکرین اِن تصورات سے اپنی آخری عمر تک مسحور رہے۔

لوگوں کے نزدیک تہذیب (civilization) اِسی انسانی خواب کی تعبیر تھی۔ موجودہ صنعتی ترقیوں کے بعد لوگوں نے یہ سمجھا کہ تہذیبی ارتقا آخر کار اُنھیں اِس منزل تک پہنچانے والا ہے، جب کہ اِسی موجودہ دنیا میں وہ اپنی جنت تعمیر کرلیں۔ لیکن یہ تصور مکمل طور پر باطل ثابت ہوا۔

دنیا کا خاتمہ

جدید سائنس کے بانی سر آئزاک نیوٹن (وفات 1727) نے 1704 میں قوانینِ طبیعی کا مطالعہ کرکے بتایا تھا کہ موجودہ دنیا 2060 میں ختم ہوجائے گی۔ (ٹائمس آف انڈیا، 18 جون 2007)۔ اب دنیا بھر کے تمام سائنس داں خالص مشاہدات کی بنیاد پر یہ بتارہے ہیں کہ گلوبل

وارمنگ کے نتیجے میں دنیا کا خاتمہ یقینی بن چکا ہے۔ تہذیب کا مزید ارتقا اب سرے سے یہاں ممکن ہی نہیں۔

الون ٹافلر (Alvin Toffler) کی کتاب 'فیوچر شاک' پہلی بار 1970 میں چھپی۔ اس کتاب میں الون ٹافلر نے بتایا تھا کہ دنیا انڈسٹریل ایج سے نکل کر اب سپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو رہی ہے۔ تہذیب کا اگلا دَور مکمل آٹومیشن (complete automation) کا دور ہوگا۔ پُش بٹن کلچر (push button culture) اِس حد تک ترقی کرے گا کہ ہر کام آٹومیٹک طور پر ہونے لگے گا۔ لیکن گلوبل وارمنگ کا مسئلہ تکمیلِ تاریخ کے بجائے خاتمۂ تاریخ (end of history) کا پیغام لے کر سامنے آ گیا۔

تاریخِ انسانی کا یہ ظاہرہ بلا شبہ آج کا سب سے بڑا سوال ہے۔ اِس سوال کی اطمینان بخش توجیہہ صرف باخدا کائنات کے نظریے میں موجود ہے۔ بے خدا کائنات کے نظریے کے تحت، اِس ظاہرے کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اِس طرح کی مثالیں واضح طور پر ثابت کرتی ہیں کہ بے خدا کائنات کے نظریے میں ایک بہت بڑا خلا موجود ہے، وہ یہ کہ اِس نظریے کو ماننے کی صورت میں ایک انتہائی بامعنیٰ کائنات ایک انتہائی بے معنیٰ انجام پر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسری طرف، باخدا کائنات کا نظریہ اِس نقص سے مکمل طور پر خالی ہے۔ باخدا کائنات کے نظریے کو ماننے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ بامعنیٰ کائنات کا انجام ایک انتہائی بامعنیٰ مستقبل پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ واقعہ، باخدا کائنات کے نظریے کے حق میں ایک ایسی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے جو عقل اور منطق کو پوری طرح مطمئن کرنے والا ہے۔

Flaw in creationists' argument, by Paul Davies

We will never explain the cosmos by taking on faith either divinity or physical laws. True meaning is to be found within nature. Scientists are slowly waking up to an inconvenient truth - the universe looks suspiciously like a fix. The issue concerns the very laws of nature themselves. For 40 years, physicists and cosmologists have been quietly collecting examples of all to convenient "coincidences" and special features in the underlying laws of the universe that seem to be necessary in order for life, and hence conscious beings, to exist. Change any one of them and the result would be lethal. To see the problem, imagine playing God with the cosmos. Before you is a designer machine that lets you tinker with the basics of physics. Twiddle this knob and you make all electrons a bit lighter, twiddle that one and you make gravity a bit stronger, and so on.

It happens that you need to set 30-something knobs to fully describe the world about us. The point is that some of those metaphorical knobs must be tuned precisely, or the universe would be sterile. Example: neutrons are just a tad heavier than protons. If it were the other way around, atoms could not exist, because all the protons in the universe would have decayed into neutrons shortly after the big bang. No protons, then no atomic nucleuses, and no atoms. No atoms, no chemistry, no life. Like Baby Bear's porridge in the story of Goldilocks, the universe seems to be just right for life. So what's going on? Fuelling the controversy is an unanswered question lurking at the very heart of science - the origin of the laws of physics. Where do they come from? Why do they have the form that they do? Traditionally, scientists have treated the laws of physics as simply "given," elegant mathematical relationships that were somehow imprinted on the universe at its birth, and fixed thereafter. Inquiry into the origin and nature of the laws was not regarded as a proper part of science.

Illusory impression

But the embarrassment of the Goldilocks enigma has prompted a rethink. The Cambridge cosmologist Martin Rees, president of The Royal Society, suggests the laws of physics aren't absolute and

universal but more akin to local bylaws, varying from place to place on a mega-cosmic scale. A God's eye view would show our universe as merely a single representative amid a vast assemblage of universes, each with this own bylaws. Mr. Rees calls this system "the multiverse," and it is an increasingly popular idea among cosmologists. Only rarely within the variegated cosmic quilt will a universe possess bio-friendly laws and spawn life. It would then be no surprise that we find ourselves in a universe apparently customized for habitation; we would hardly exist in one where life is impossible. The multiverse theory cuts the ground from beneath intelligent design, but it falls short of a complete explanation of existence. For a start there has to be a physical mechanism to make all those universes and allocate bylaws to them. This process demands its own laws, or meta-laws. Where do they come from?

The root cause of all the difficulty can be traced to the fact that both religion and science appeal to some agency outside the universe to explain its law-like order. Dumping the problem in the lap of a pre-existing designer is no explanation at all, as it merely begs the question of who designed the designer. But appealing to a host of unseen universes and a set of unexplained meta-laws is scarcely any better. This shared failing is no surprise, because the very notion of physical law has its origins in theology. The idea of absolute, universal, perfect, immutable laws comes straight out of monotheism, which was the dominant influence in Europe at the time science as we know it was being formulated by Isaac Newton and his contemporaries. Just as classical Christianity presents God as upholding the natural order from beyond the universe, so physicists envisage their laws as inhabiting an abstract transcendent realm of perfect mathematical relationships. Furthermore, Christians believe the world depends utterly on God for its existence, while the converse is not the case. Correspondingly, physicists declare that the universe is governed by eternal laws, but the laws remain impervious to events in the universe.

Outdated Theory

I think this entire line of reasoning is now outdated and simplistic. We

will never fully explain the world by appealing to something outside it that must simply be accepted on faith, be it an unexplained God or an unexplained set of mathematical laws. Can we do better? I propose that the laws are more like computer software: programmes being run on the great cosmic computer. They emerge with the universe at the big bang and are inherent in it, not stamped on it from without like a maker's mark. Man-made computers are limited in their performance by finite processing speed and memory. So too, the cosmic computer is limited in power by its age and the finite speed of light. Seth Lloyd, an engineer at MIT, has calculated how many bits of information the observable universe has processed since the big bang. The answer is one followed by 122 zeros. Crucially, however, the limit was smaller in the past because the universe was younger. Just after the big bang, when the basic properties of the universe were being forged, its information capacity was so restricted that the consequences would have been profound.

Here's why. If a law is a truly exact mathematical relationship, it requires infinite information to specify it. In my opinion, however, no law can apply to a level of precision finer than all the information in the universe can express. Infinitely precise laws are an extreme idealization with no shred of real world justification. In the first split second of cosmic existence, the laws must therefore have been seriously fuzzy. Then, as the information content of the universe climbed, the laws focused and homed in on the life-encouraging form we observe today. But the flaws in the laws left enough wiggle room for the universe to engineer its own bio-friendliness. If there is an ultimate meaning to existence, as I believe is the case, the answer is to be found within nature, not beyond it. The universe might indeed be a fix, but if so, it has fixed itself. (Paul Davies is director of Beyond, a research center at Arizona State University, and author of The Goldilocks Enigma.)

(www.thehindu.com/todays-paper/tp-opinion/Flaw-in-creationistsrsquo-argument/article14783277.ece [retrieved 29.05.2020])

خدا اور سائنس

آئن اسٹائن کے بارے میں لوگوں کے درمیان کنفیوژن (confusion) پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ آئن اسٹائن کا کیس منکرِ خدا (atheist) کا کیس تھا۔ کچھ دوسرے لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ مگر آئن اسٹائن کے مختلف بیانات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئن اسٹائن منکرِ خدا نہیں تھا، بلکہ وہ خدا کے وجود کے بارے میں شک کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

1945 میں امریکی بحریہ کے ایک جونیر افسر گائے ریز (Guy Raner) نے خط کے ذریعے آئن اسٹائن سے سوال کیا تھا — کیا آپ ڈکشنری کے مفہوم کے اعتبار سے، منکرِ خدا ہیں، یعنی وہ آدمی جو خدا کے وجود میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ اِس کے جواب میں آئن اسٹائن نے لکھا کہ آپ مجھ کو لاادریہ کہہ سکتے ہیں، مگر میں پروفیشنل قسم کے منکرِ خدا سے اتفاق نہیں رکھتا:

In 1997, Skeptic, a hard unbelief science magazine, published for the first time a series of letters Einstein exchanged in 1945 with a junior officer in the US navy named Guy Raner on the same topic. Raner wanted to know if it was true that Einstein converted from atheism to theism when he was confronted by a Jesuit priest with the argument that a design demands a designer and since the universe is a design there must be a designer. Einstein wrote back that he had never talked to a Jesuit priest in his life but that from the viewpoint of such a person, he was and would always be an atheist. He added it was misleading to use anthropomorphical concepts in dealing with things outside the human sphere and that we had to admire in humility the beautiful harmony of the structure of this world as far as we could grasp it. But Raner persisted."Are you from the viewpoint of the dictionary," he wrote back, "an atheist, one who disbelieves in the existence of a God, or a Supreme Being." To this Einstein replied: "You may call me an agnostic, but I do not share the crusading spirit of the professional atheist whose fervour is mostly due to a painful act of liberation from the fetters of religious indoctrination received in youth." (The Times of India, New Delhi, May 18, 2012)

عقیدۂ خدا کے بارے میں آئن اسٹائن کا جو موقف ہے، وہی موقف تقریباً تمام سائنس دانوں کا ہے۔ خدا سائنسی مطالعہ (scientific study) کا موضوع نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس داں خدا کا انکار نہیں کرتے، وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لاادریہ (agnostic) بتاتے ہیں، یعنی ایک ایسا موقف جب کہ انسان نہ انکار کرنے کی پوزیشن میں ہو، اور نہ اقرار کرنے کی پوزیشن میں۔

یہ صحیح ہے کہ سائنس کے مطالعے کا موضوع مادی دنیا (material world) ہے۔ مگر مادی دنیا کیا ہے، وہ خالق کی تخلیق (creation) ہے۔ اِس لیے سائنس کا مطالعہ بالواسطہ طور پر خالق کی تخلیق کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ ایک سائنس داں خالق کے عقیدے کا انکار کرسکتا ہے۔ لیکن تخلیقات میں خالق کی جو نشانیاں (signs) موجود ہیں، اُن کا انکار ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ سائنس نے جس مادّی دنیا (physical world) کو دریافت کیا ہے، اس میں حیرت انگیز طور پر ایسی حقیقتیں پائی جاتی ہیں، جو اپنی نوعیت میں غیر مادی ہیں۔ مثلاً معنویت، ڈزائن، ذہانت اور بامقصد پلاننگ، وغیرہ۔ مادی دنیا کی نوعیت کے بارے میں یہ دریافت گویا خالق کے وجود کی بالواسطہ شہادت ہے۔ خدا کے وجود کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ایک سائنسی طریقہ یہاں قابلِ انطباق (applicable) ہے، وہ یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ سائنس کی دریافت کردہ دنیا کس نظریے کی تصدیق کررہی ہے، انکارِ خدا کے نظریے کی تصدیق یا اقرارِ خدا کے نظریے کی تصدیق۔ اِس اصولِ استدلال کو سائنس میں ویری فکیشن ازم (verificationism) کہا جاتا ہے۔

سائنس میں استدلال کا ایک اصول ہے، جس کو اصولِ مطابقت (principle of compatibility) کہا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نظریہ جو بذاتِ خود قابلِ مشاہدہ نہ ہو، لیکن وہ مشاہدۂ کے ذریعے دریافت کردہ معلومات سے مطابقت رکھتا ہو، تو اِس بالواسطہ شہادت کی بنا پر اِس نظریے کو حقیقت کا درجہ دے دیا جائے گا۔ جس نظریے کے حق میں اِس قسم کی مطابقت موجود ہو، اس کو بالواسطہ تصدیق کی بنا پر بطورِ حقیقت تسلیم کرلیا جائے گا۔ سائنس کے اِس اصولِ استدلال کو اگر عقیدۂ خدا کے معاملے میں منطبق کیا جائے تو اصولی طور پر خدا کا عقیدہ ایک ثابت شدہ عقیدہ بن جاتا

ہے۔جو سائنس داں اپنے کیس کو لا ادریہ (agnosticism) کا کیس بتاتے ہیں، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر فرار کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ خود اپنے علم کے مطابق، خدا کا انکار نہیں کر سکتے، وہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کا کیس لاادریہ (agnostic) کا کیس ہے۔

عقیدۂ خدا اور سائنس

خالص سائنسی نقطۂ نظر کے مطابق، خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔ سائنس نے اپنے طریقِ مطالعہ کے ذریعے جس چیز کو دریافت کیا ہے، وہ ہے— الیکٹران (electron) اور نیوٹران (neutron) اور پروٹان (proton)۔ مگر اِسی کے ساتھ یہ واقعہ ہے کہ اب تک کسی سائنس داں نے الیکٹرانس اور نیوٹرانس اور پروٹانس کو نہیں دیکھا ہے، نہ آنکھ سے اور نہ خوردبین سے، پھر سائنس داں اُن کے وجود پر یقین کیوں رکھتے ہیں۔ سائنس داں کے پاس اِس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہم اُن کو براہِ راست نہیں دیکھتے، لیکن ہم اُن کے اثرات (effects) کو دیکھ رہے ہیں:

Though we cannot see them, we can see their effects.

مزید مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف کاز اینڈ افیکٹ (cause and effect) کا مسئلہ نہیں ہے۔ اِس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ کائنات میں اعلیٰ درجے کی ذہانت (intelligence) ہے۔ کائنات میں اعلیٰ درجے کی ہم آہنگی (harmony) ہے۔ کائنات میں اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی (planning) ہے۔ اس بات کو ٹاپ کے سائنس دانوں نے تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جیمس جینز (James Hopwood Jeans [1877-1946])، آرتھر ایڈنگٹن (Arthur Stanley Eddington [1882-1944])، البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein [1879-1955])، ڈیوڈ فوسٹر (David Foster) اور فریڈ ہائل (Fred Hoyle [1915-2001])، وغیرہ۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ، ایک سائنس داں کے الفاظ میں، کائنات کی جنس، ذہن (mind-stuff) ہے:

> Molecular biology has conclusively proved that the "matter of organic life, our very flesh, really is mind-stuff."

عقیدۂ خدااور سائنس کے معاملے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ مذہب میں جس خدا کو بطورِ عقیدہ پیش کیا گیا تھا، وہ اگرچہ سائنس کا براہِ راست موضوع نہیں، لیکن سائنس کی دریافتیں بالواسطہ طور پر عقیدۂ خدا کی علمی تصدیق (affirmation) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سائنس نے خدا کے عقیدے کو ثابت نہیں کیا ہے، البتہ یہ کہنا درست ہے کہ سائنس نے عقیدۂ خدا کے ثبوت کا ڈیٹا فراہم کر دیا ہے۔ سائنس کے اسٹینڈرڈ ماڈل میں ایک چیز مسنگ لنک (missing link) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ماڈل فعل (action) کو بتاتا تھا، مگر وہ فاعل (actor) کو نہیں بتاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں، قرآن کائنات کا جو ماڈل دے رہا ہے، اس میں فعل اور فاعل دونوں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن میں سبب (cause) کے ساتھ مسبّب (causative factor) کو بھی بتایا گیا ہے۔ سائنس جب فعل (ذہانت) کی تصدیق کر رہی ہے تو منطقی طور پر اِس کا جواز نہیں کہ وہ فاعل (ذہن) کی تصدیق نہ کرے۔

خدا کا وجود

البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) اگرچہ ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا، لیکن سائنسی مطالعے کے بعد وہ خدا کے وجود کے بارے میں تشکیک میں مبتلا ہو گیا۔ اپنی وفات سے ایک سال پہلے 3 جنوری 1954 کو اس نے ایک اسرائیلی فلسفی ایرک (Eric B. Gutkind) کو جرمن زبان میں ایک خط لکھا۔ اِس خط کا ایک جملہ یہ تھا — خدا کا لفظ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کی ایک پیداوار ہے:

> The word God was nothing more than the expression and product of human weaknesses.

آئن اسٹائن نے جس چیز کو ''انسانی کمزوری'' بتایا ہے، وہ کمزوری نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے۔ اِس خصوصیت کو درست طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان ایک توجیہہ طلب حیوان (explanation-seeking animal) ہے۔ انسان کی یہی خصوصیت تمام علمی ترقیوں کی بنیاد ہے۔ اِسی خصوصیت کی بنا پر انسان چیزوں کی توجیہہ تلاش کرتا ہے، اور پھر وہ

بڑی بڑی ترقیوں تک پہنچتا ہے۔انسان کے اندر اگر یہ خصوصیت نہ ہوتی تو انسانی تہذیب (human civilization) پوری کی پوری غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی رہتی۔

خود آئن اسٹائن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری 30 سال کے دوران وہ ایک سوال کا سائنسی جواب پانے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ اِس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ سوال آئن اسٹائن کے الفاظ میں، یونی فائڈ فیلڈ تھیوری (unified field theory) کی دریافت ہے۔سائنسی اعتبار سے یہ سوال اتنا زیادہ اہم ہے کہ آج وہ تمام نظریاتی سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔اب اِس سوال کو عام طور پر تھیوری آف ایوری تھنگ (Theory of Everything) کہا جاتا ہے۔

یہ 'تھیوری آف ایوری تھنگ' کیا ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا ریاضیاتی فارمولا دریافت کرنا ہے، جو تمام کائناتی مظاہر کی سائنسی توجیہہ کر سکے۔تھیوری آف ایوری تھنگ کا مطلب ہے:

Theory that explains everything.

ایک سائنسی ادارہ (European Organization for Nuclear Research) کے تحت سوئزر لینڈ میں ایک پروجیکٹ قائم کیا گیا۔ اس کا نام یہ تھا— لارج ہیڈرون کولائڈر (Large Hadron Collider)۔ یہ پروجیکٹ 1998 میں قائم کیا گیا۔ اِس پروجیکٹ پر ایک سوملین ڈالر خرچ ہوئے۔ اِس میں دنیا کے ایک سو ملک اور دس ہزار سائنس دانوں اور انجینئروں کا تعاون شامل تھا۔ اگرچہ یہ پروجیکٹ کامیاب نہ ہوسکا، تاہم اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ 'تھیوری آف ایوری تھنگ' کو دریافت کیا جائے۔

'تھیوری آف ایوری تھنگ ، یا زیادہ درست طور پر، ایکسپلنیشن آف ایوری تھنگ کی تلاش پر تقریباً 90 سال گزر چکے ہیں، مگر اِس معاملے میں سائنس دانوں کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مظاہرِ کائنات کی توجیہہ خدا کے وجود کو مان کر حاصل ہوتی ہے۔ کوئی ریاضیاتی فارمولا کبھی اِس کا جواب نہیں بن سکتا۔ریاضیاتی فارمولے میں اِس سوال کا جواب تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے پیاس کو بجھانے کے لیے پانی کے سوا کسی اور چیز کو اس کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا۔

خدا کو کس نے پیدا کیا

انسان جب رحمِ مادر (womb) کے خول میں ہوتا ہے، تو اس کو اُس وقت خول کے باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اِس خول کے باہر ایک پوری دنیا موجود ہوتی ہے، لیکن بچے کو اِس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خود انسان کا بھی ہے۔ انسان کی تمام معلومات زمان ومکان (time and space) کے اندر تک محدود ہوتی ہیں۔ وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقتوں کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا۔ برٹش فلسفی جان اسٹوارٹ مِل (وفات 1873) جب نوجوانی کی عمر میں تھا، اُس وقت اس کے باپ جیمس مل (وفات 1836) نے اُس سے کہا کہ خدا کا عقیدہ ایک غیر عقلی عقیدہ ہے۔ کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا:

If God created man, who created God.

یہ بات جان اسٹوارٹ مل نے اپنی آٹو بائگریفی میں لکھی۔ اِس کے بعد اِس بات کو برٹرنڈ رسل (وفات 1970) اور جولین ہکسلے (وفات 1975) جیسے فلاسفہ دہرانے لگے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ جیمس مل کے تقریباً سو سال بعد 1916 میں البرٹ آئن اسٹائن (وفات 1955) نے نظریۂ اضافیت (theory of relativity) پیش کیا۔ اِس نظریے کے تحت آئن اسٹائن نے دکھایا کہ اِس دنیا میں انسان کا ہر علم اضافی (relative) ہے، نہ کہ حقیقی (real)۔ گویا آئن اسٹائن نے ثابت کیا کہ انسان کے پاس کوئی مطلق فریم آف ریفرنس موجود نہیں:

No absolute frame of reference exists.

جیمس مل کے زمانے میں انسان کا علم ایک سائنٹفک خول (scientific womb) کے اندر محدود تھا۔ آئن اسٹائن (Albert Einstein) نے سو سال بعد انسان کو اِس خول کی موجودگی کی خبر دی۔ ایسی حالت میں اب انسان کے لیے عقلی رویہ صرف یہ ہے کہ وہ بالاتر حقائق کے بارے میں اپنی علمی محدودیت (limitations) کا اعتراف کرے، نہ کہ وہ اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ علمی بیانات دینے لگے۔

خدا کا عقیدہ

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا اصل مسئلے کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ ''بے سبب'' خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو ''بے سبب'' میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بہ ظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعے کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہیے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں، اس لیے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق اس کو لازمی قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ جب ہم بے سبب خدا کو مانتے ہیں تو ہم دو ممکن ترجیحات میں سے آسان تر کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلے میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

یہ صرف خدا کے وجود کا معاملہ نہیں۔ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے، اس دنیا میں کوئی بھی چیز نہ ثابت(prove) کی جاسکتی، اور نہ غیر ثابت (disprove) کی جاسکتی۔ کسی بھی چیز کو ماننے کے معاملے میں یہاں انتخاب(option) ثابت شدہ(proved) اورغیر ثابت شدہ(unproved) کے درمیان نہیں۔ بلکہ ہر انتخاب ورک ایبل(workable)اور نان ورک ایبل(non-workable) کے درمیان ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اہلِ سائنس عام طور پر کشش (gravity) کے نظریے کو مانتے ہیں۔مگر یہ ماننا اس لیے نہیں کہ کشش ثقل کوئی ثابت شدہ نظریہ ہے۔ نیوٹن نے سیب کو درخت سے گرتے ہوئے دیکھ کر یہ سوال کیا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا، اور پھر تحقیق کرکے اس نے کششِ ارض کا نظریہ دریافت کیا۔مگر ایک سائنس داں نے کہا کہ نیوٹن کو اس پر تعجب ہوا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا۔ مجھے یہ تعجب ہے کہ سیب اوپر کیسے گیا۔ درخت کی جڑ نیچے کی طرف جاتی ہے، اور اس کا تنہ اوپر کی طرف۔ اگر جڑ کے نیچے جانے کا سبب یہ بتایا جائے کہ زمین میں کشش ہے تو تنہ اور شاخوں کے اوپر جانے کی توجیہہ کس طرح کی جائے گی۔

یہی معاملہ تمام سائنسی نظریات کا ہے۔ سائنس میں جب بھی کسی نظریے(theory) کو مانا جاتا ہے تو وہ غیر ثابت شدہ کے مقابلے میں ثابت شدہ کو ماننا نہیں ہوتا۔ بلکہ نان ورک ایبل تھیری (non-workable theory) کے مقابلے میں ورک ایبل تھیری (workable theory) کو ماننا ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول نظریۂ خدا کے معاملے میں بھی چسپاں ہوتا ہے۔

کشش کے معاملے میں ہمارے لیے جو انتخاب ہے وہ کشش رکھنے والے مادہ اور بے کشش مادہ میں نہیں ہے۔ بلکہ کشش رکھنے والے مادہ اور غیر موجود مادہ میں ہے۔ چونکہ غیر موجود مادے کا نظریہ ورک ایبل نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے کشش رکھنے والے مادہ کا انتخاب لے رکھا ہے، خالص علمی اعتبار سے یہی معاملہ خدا کے عقیدہ کا بھی ہے۔

کائنات کے اندر تخلیق کی صلاحیت نہیں، وہ اپنے اندر کے ایک ذرے کو نہ گھٹا سکتی، اور

نہ بڑھا سکتی۔ اس لیے، دوسرے تمام سائنسی نظریات کی طرح، یہاں بھی ہمارے لیے انتخاب باخدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات (non-existent universe) میں ہے۔ چونکہ ہم غیر موجود کائنات کا انتخاب نہیں کرسکتے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ باخدا کائنات کے نظریے کا انتخاب کریں۔

☆☆☆☆☆

سائنس اور خدا

بہ ظاہر سائنس خدا کے بارے میں غیر جانب دار ہے۔ مگر یہ غیر جانب داری سراسر مصنوعی ہے۔ سائنسی مطالعہ واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ کائنات کا نظام ایسے محکم انداز میں بنا ہے کہ اس کے پیچھے ایک خالق کو مانے بغیر اس کی توجیہہ ممکن نہیں۔ سر جیمز جینز نے 1932 میں کہا تھا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا نقشہ ایک خالص ریاضی داں نے تیار کیا ہے:

In 1932, Sir James Jeans, an astrophysicist said: "The universe appears to have been designed by a pure mathematician". (Encyclopedia Britannica [1984] 15/531)

سر جیمز جینز نے جو بات کہی تھی، دوسرے متعدد سائنس دانوں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کا اقرار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا ریاضیاتی اصولوں پر بننا، اور اس کا ریاضیاتی اصولوں پر حرکت کرنا، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک ایسا ذہن کام کررہا ہے، جو ریاضیاتی قوانین کا شعور رکھتا ہے۔

اللہ کی رؤیت

حدیث کی کتابوں میں ایک روایت آئی ہے، جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے۔ اس حدیث کا ایک جزء یہ ہے: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 50)۔ یعنی تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھتے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں عبادت کی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ حدیث پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اگرچہ براہِ راست اللہ کی رؤیت (دیدار) ممکن نہیں، لیکن انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ شبہ رؤیت کے درجے میں اللہ کو پا سکے۔ رؤیت اور شبہِ رؤیت کے درمیان اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

کسی آدمی کو اللہ کی شبہِ رؤیت کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ ہے اللہ کی تخلیق میں غور وفکر کرنا۔ اللہ اپنی ذات کے اعتبار سے اگرچہ ہمارے سامنے ظاہر نہیں ہے۔ لیکن اپنی صفات کے اعتبار سے وہ اپنی تخلیقات میں پوری طرح نمایاں ہے۔ تخلیق گویا خالق کی معرفت کا آئینہ ہے۔ جس نے تخلیق کو دیکھا، اس نے گویا خالق کو دیکھ لیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کسی نے آرٹ کو دیکھا تو اس نے گویا آرٹسٹ کو دیکھ لیا۔

موجودہ زمانے میں اہلِ سائنس نے یہ دریافت کیا ہے کہ کائنات ایک ذہین کائنات (intelligent universe) ہے۔ یہ دریافت اپنے آپ میں بتاتی ہے کہ کائنات میں ذہن کی کارفرمائی ہے۔ ایسا ہے تو یقینی طور پر یہاں کوئی صاحبِ ذہن موجود ہے۔ ذہن کی کارفرمائی سے ذہن کا وجود ثابت ہوتا ہے، اور ذہن کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ایک صاحبِ ذہن ہستی موجود ہے۔ سائنس کی زبان میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ دریافت کے بعد خالق کا وجود پرابیبلیٹی (probability) کے درجے میں ثابت ہوجاتا ہے۔

کون کنٹرول کرے

سر جولین ہکسلے (Sir Julian Sorell Huxley [1887-1975]) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ''مذہب بغیر الہام'' ہے:

Julian Huxley: *Religion Without Revelation* (1957), Harper, p. 393

مصنّف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب (بمعنی انسانی طریقہ) الہام خداوندی کی بنیاد پر قائم کرنے کا دور ختم ہو گیا۔ اب انسان خود اپنا مذہب بنا رہا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد عقل (ریزن) پر ہے، اور اس کا نام ہیومنزم ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر کا خلاصہ اس کے ان الفاظ میں ہے — موجودہ زمانے میں انسان نے بڑی حد تک خارجی فطرت کی طاقتوں کو جاننے، ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھ لیا ہے۔ اب اس کو خود اپنی فطرت کی طاقتوں کو جاننے اور ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھنا ہے:

> Man has learnt in large measure to understand, control and utilize the forces of external nature: he must now learn to understand, control and utilize the forces of his own nature.

یہی موجودہ زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ملحدین کا عام نظریہ ہے۔ مگر یہ لفظی تک بندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی مادے کو کنٹرول کرنا جتنا ممکن تھا، اتنا ہی یہ ناممکن ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کو کنٹرول کرے۔

مادہ خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ اسی طرح انسان بھی خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ انسان کے لیے مادہ کو کنٹرول کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ انسان کو اپنے دماغ کی بنا پر مادہ کے اوپر بالاتری حاصل تھی۔ اسی طرح انسان کو وہ ہستی کنٹرول کرسکتی ہے، جس کو انسان کے اوپر بالاتری حاصل ہو۔ کوئی بھی ہستی اپنے برابر کو کنٹرول نہیں کرسکتی — انسان کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک برتر خدا کا عقیدہ درکار ہے۔ برتر خدائی عقیدے کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کو قابو میں رکھ سکے۔

حکمتِ تخلیق

12 جون 2009 کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے انگریزی زبان میں کچھ کہہ رہا ہے۔ دورانِ گفتگو اُس نے کہا کہ اگر خدا ہے، اور خدا نے موجودہ دنیا کو پیدا کیا ہے تو ہماری زندگی میں اتنی زیادہ سفرنگ (suffering) کیوں:

If there is a God, and God has created the world, then why there is so much suffering in our lives?

اِس خواب کا سوال مجھے یاد ہے، لیکن اس کا جواب مجھے یاد نہیں۔ تاہم میں کہوں گا کہ دنیا کی زندگی میں ہم کو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں، وہ مصیبتیں نہیں ہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ چیلنج ہیں۔ وہ انسانی ذہن کو جگاتی ہیں۔ وہ انسان کی عملی قوتوں کو متحرک کرتی ہیں۔ یہ مصیبتیں ہمارے لیے ایک مثبت تجربہ ہیں، وہ کوئی منفی تجربہ نہیں۔

خدا کی تخلیق کے مطابق، اِس دنیا میں ہر چیز کو پوٹنشیل (potential) کے روپ میں پیدا کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ انسان کو غیر معمولی دماغ دیا گیا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو استعمال کرے، اور پوٹینشیل کو ایکچوَل (actual) میں تبدیل کرے۔

زندگی کا نظام اگر اِس طرح ہو کہ یہاں آدمی کو کوئی مسئلہ پیش نہ آئے تو اس کی زندگی میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوگی، اس کی زندگی میں کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ ایسا انسان ایک جامد انسان ہوگا۔ وہ حیوان کی مانند جیے گا، اور حیوان کی مانند زندگی گزار کر مر جائے گا۔ لیکن فطرت کا یہ نقشہ نہیں۔ فطرت کا مطلوب انسان وہ ہے، جو حقیقتوں کا سامنا کرے، جو ہلچل کے واقعات کو اپنی شخصیت کی مثبت تعمیر میں استعمال کرے، جو اپنی ذات میں چھپے ہوئے امکانات کو اپنی جدوجہد سے واقعہ (actual) بنائے۔ جو ناموافق حادثات کو اپنے موافق بنانے کا کارنامہ انجام دے، جو معمولی انسان کی حیثیت سے پیدا ہو، اور جب وہ مرے تو وہ ایک غیر معمولی انسان بن چکا ہو۔

تاریخ کے فکری مغالطے

فلسفہ قیاسی علوم (speculative sciences) میں سے ایک علم ہے۔ فلسفہ قدیم ترین شعبۂ علم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے دماغ فلسفیانہ غور وفکر میں مشغول رہے ہیں۔ لیکن لمبی تاریخ کے باوجود فلاسفہ کا گروہ انسان کو کوئی مثبت چیز نہ دے سکا، بلکہ فلسفے نے صرف انسان کی فکری پیچیدگیوں میں اضافہ کیا۔ فارسی شاعر نے بالکل درست طور پر کہا ہے:

فلسفی سرِّ حقیقت نہ توانست کشود　　گشت رازِ دیگرآں راز کہ افشامی کرد

فلسفہ نے انسان کو جو چیزیں دیں، ان کو ایک لفظ میں فکری مغالطہ کہا جا سکتا ہے، یعنی ایسے قیاسات جو حقیقتِ واقعہ پر مبنی نہ ہوں۔ افکار کی تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

تمام فلسفیوں کی مشترک غلطی یہ رہی ہے کہ ہر ایک کے ذہن میں چیزوں کا ایک معیاری ماڈل (ideal model) بسا ہوا تھا، جو کبھی اور کسی دور میں حاصل نہ ہوسکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فلسفیوں کا یہ ماڈل دنیا کے بارے میں خالق کے تخلیقی نقشے سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ خالق نے موجودہ دنیا کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے، نہ کہ انعام کے لیے۔ اسی امتحان کے لیے انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ یہ امتحانی آزادی اس راہ میں رکاوٹ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی معیاری نظام بن سکے۔

معیاری نظام صرف اس وقت بن سکتا ہے جب کہ تمام لوگ بغیر استثنا اپنی آزادی کو بالکل صحیح صورت میں استعمال کریں، تاہم مختلف اسباب سے ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ اس لیے اس دنیا میں معیاری نظام کا بننا بھی کبھی ممکن نہیں۔ تاریخ کے تمام فلسفی اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام فلسفی اپنے ذہنی ماڈل کے مطابق، معیاری نظام کا خواب دیکھتے رہے۔ مگر فطرت کے قانون کے مطابق، ان کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ یہاں بطور نمونہ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

استدلال کی بنیاد

انیسوی صدی عیسوی میں جب سائنسی مشاہدے کا طریقہ دنیا میں رائج ہوا تو فلسفیوں کے اندر

ایک نیا فکر پیدا ہوا جس کا یہ کہنا تھا کہ حقیقت وہی ہے جو قابلِ مشاہدہ (observable) ہو، جو معلوم سائنسی طریقوں کے مطابق قابلِ تصدیق (verifiable) ہو۔ اسی سوچ کے تحت مختلف اسکول آف تھاٹ بنے۔ مثلاً انیسویں صدی کا فرنچ فلسفی آگسٹ کامٹے (Auguste Comte) کا پازیٹیوازم (Positivism) اور بیسویں صدی کے جرمن فلاسفر رڈولف کارنیپ (Rudolf Carnap) کا لاجیکل پازیٹیوازم، وغیرہ۔

اس قسم کے مفکروں اور فلسفیوں نے تقریباً سو سال تک دنیا بھر کے ذہنوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو چیز مشاہدے میں نہ آئے وہ حقیقت بھی نہیں۔ ان نظریات کے تحت وہ فلسفہ پیدا ہوا جس کو سائنسی الحاد (scientific atheism) کہا جاتا ہے۔ ان نظریات کے مطابق، خدا اور مذہب کا عقیدہ علمی اعتبار سے بے بنیاد ثابت ہو گیا۔

علمی حلقوں میں سائنسی الحاد پر چرچا جاری تھا کہ خود سائنس نے اس نظریے کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ سائنس میں یہ تبدیلی اس وقت آئی جب کہ سائنس دانوں نے اس حقیقت کو دریافت کیا، جس کو کوانٹم میکینکس (quantum mechanics) کہا جاتا ہے۔ اس سائنسی نظریے کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ایٹمی ذرات کو امواج (waves) سمجھا جانے لگا۔ اس سائنسی دریافت میں خاص طور پر حسبِ ذیل سائنس دانوں کے نام شامل ہیں:

Erwin Schrödinger (1887-1961), Albert Einstein (1879-1955), Werner Heisenberg (1901-1976), Pascual Jordan (1902-1980), Paul Dirac (1902-1084).

اس سائنسی دریافت نے قدیم نیوٹینین میکینکس کو علمی طور پر قابلِ رد قرار دے دیا۔ اب علم کا دریا عالم کبیر (macro world) سے گزر کر عالم صغیر (micro world) تک پہنچ گیا، یعنی دکھائی دینے والی چیزوں کے علاوہ نہ دکھائی دینے والی چیزیں بھی علم کا موضوع بن گئیں۔

یہ ایک دوررس فکری انقلاب تھا جو بیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آیا۔ اس کے نتیجے میں جو نظریاتی تبدیلیاں ہوئیں، ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ استدلال کا اصول

(principle of reason) بدل گیا۔ اس فکری انقلاب سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ جائز استدلال (valid argument) وہی ہے، جو براہِ راست استدلال (direct argument) ہو، یعنی مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی استدلال۔ مگر اب استنباطی استدلال (inferential argument) بھی یکساں طور پر جائز استدلال بن گیا۔ جب جوہری ذرّات (subatomic particles) ناقابلِ مشاہدہ ہونے کے باوجود صرف استنباطی استدلال کی بنیاد پر ایک سائنسی واقعہ تسلیم کر لیے گئے تو لازمی طور پر اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ استنباطی استدلال کی بنیاد پر خدا کا استدلال بھی عین اسی طرح جائز سائنسی استدلال ہے۔

علمائے الٰہیات خدا کے وجود پر ایک دلیل وہ دیتے تھے، جس کو ڈزائن سے استدلال (argument from design) کہا جاتا ہے۔ یعنی جب ڈزائن ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک ڈزائنر ہو۔ اس استدلال کو پہلے ثانوی استدلال (secondary rationalism) مانا جاتا ہے۔ مگر اب جدید سائنسی انقلاب کے بعد یہ استدلال بھی اسی طرح ابتدائی استدلال (primary rationalism) کی فہرست میں آچکا ہے، جیسا کہ دوسرے معروف سائنسی استدلالات۔

ڈارونزم کا نظریہ

انھیں فکری مغالطوں میں سے ایک مغالطہ وہ ہے جس کو ڈارونزم (Darwinism) کہا جاتا ہے۔ اس فکر کو موجودہ زمانے میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس نظریے کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں، اور تمام یونیورسٹیوں میں اس کو باقاعدہ نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا سائنٹفک تجزیہ کیجیے تو وہ ایک خوب صورت مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ڈارونزم کے نظریے کو دوسرے لفظوں میں عضویاتی ارتقا (organicevolution) کہا جاتا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت پہلے زندگی ایک سادہ زندگی سے شروع ہوئی۔ پھر توالد وتناسل کے ذریعے وہ بڑھتی رہی۔ حالات کے اثر سے اس میں مسلسل تغیر ہوتا رہا۔ یہ تغیرات مسلسل ارتقائی سفر کرتے رہے۔ اس طرح ایک ابتدائی نوع مختلف انواع (species) میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اس لمبے عمل کے دوران ایک مادی قانون اس کی رہنمائی کرتا رہا۔ یہ مادی قانون ڈارون کے الفاظ

میں نیچرل سلکشن تھا۔ اس نظریے میں بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ دو مشابہ نوع کا حوالہ دیتا ہے، اور پھر یہ دعوی کرتا ہے کہ لمبے حیاتیاتی ارتقا کے ذریعے ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہوگئی۔ مثلاً بکری دھیرے دھیرے زرافہ بن گئی، وغیرہ۔

یہ نظریہ بکری اور زرافہ کو تو ہمیں دکھاتا ہے، لیکن وہ درمیانی انواع اس کی فہرست میں موجود نہیں ہیں، جو تبدیلی کے سفر کو عملی طور پر ثابت کریں۔ نظریۂ ارتقا کے وکیل ان درمیانی کڑیوں کو مسنگ لنک (missing link) کہتے ہیں۔ لیکن یہ مسنگ لنک صرف ایک قیاسی لنک ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ کے اعتبار سے سرے سے ان کا کوئی وجود نہیں۔

اس نظریے کی مقبولیت کا راز صرف یہ تھا کہ وہ سیکولر اہلِ علم کو ایک کام چلاؤ نظریہ (workable theory) دکھائی دیا۔ لیکن کوئی نظریہ اس طرح کے قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ کسی نظریے کو ثابت شدہ نظریہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر معلوم حقائق موجود ہوں جو اس کی تصدیق کرتے ہوں، لیکن ڈارونزم کی تائید کے لیے ایسے حقائق موجود نہیں۔ مثال کے طور پر، ڈارونزم کے مطابق، حیاتیاتی ارتقا کے لیے بہت زیادہ لمبی مدت درکار ہے۔ سائنسی دریافت کے مطابق موجودہ زمین کی عمر اس کے مقابلے میں بہت زیادہ کم ہے۔ ایسی حالت میں بالفرض اگر ارتقا حیات کا ڈرامہ ڈارو ینی نظریہ کے مطابق آیا ہوتو وہ موجودہ محدود زمین کے اوپر کبھی واقع نہیں ہوسکتا۔

زمین کی محدود عمر کے بارے میں جب سائنس کی دریافت سامنے آئی تو اس کے بعد ارتقا کے وکیلوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ زندگی باہر کسی اور سیارہ پر پیدا ہوئی، پھر وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی۔ اس ارتقائی نظریے کو انھوں نے مفروضہ طور پر پینس پرمیا (Panspermia) کا نام دیا۔ اب دوربینوں اور خلائی سفروں کے ذریعے خلا میں کچھ مفروضہ سیاروں کی دریافت شروع ہوئی۔ مگر بے شمار کوششوں کے باوجود اب تک یہ مفروضہ سیارہ دریافت نہ ہوسکا۔

ہیومنزم کا نظریہ

اسی قسم کا فکری مغالطہ وہ ہے، جس کو ہیومنزم (Humanism) کہا جاتا ہے۔ یعنی مبنی بر

انسان توجیہہ کائنات (human-based explanation of universe)۔ اس فلسفے کے تحت خدا کے عقیدے کو حذف کر کے صرف انسان کی بنیاد پر زندگی کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ اس نظریے کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے — خدا سے انسان کو سیٹ کا منتقل ہونا:

Transfer of seat from God to man.

اس نظریے کی حمایت میں بیسویں صدی عیسوی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ انھیں میں سے ایک کتاب وہ ہے، جو انگریز فلسفی جولین ہکسلے (وفات 1975) نے تیار کر کے شائع کی۔ کتاب کے موضوع کے مطابق، اس کا ٹائٹل یہ تھا:

Man Stands Alone.

یہ کتاب پوری کی پوری صرف دعوی اور قیاس پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ مثلاً اس میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ اب انسان کو وحی کی ضرورت نہیں، اب انسان کی رہنمائی کے لیے عقل بالکل کافی ہے۔ مگر اس دعوی کی تائید میں کتاب کے اندر کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ امریکی سائنس داں کریسی ماریسن (وفات 1951) نے خالص علمی انداز میں اس کتاب کا جواب دیا۔ یہ کتاب جولین ہکسلے کے دعوی کو بالکل بے بنیاد ثابت کرتی ہے:

Man Does not Stand Alone.

خاتمہ

ہسٹری آف تھاٹ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ افکار کے اعتبار سے انسانی تاریخ کے دو دور ہیں۔ ایک قبل سائنس دور (pre-scientific era) اور دوسرا، بعد سائنس دور (post-scientific era)۔ قبل سائنس دور میں لوگوں کو اشیا کی حقیقت معلوم نہ تھی، اس لیے محض قیاس آرائی کے تحت چیزوں کے بارے میں رائے قائم کر لی گئی۔ اس لیے قبل سائنس دور کو توہماتی دور (age of superstition) کہا جاتا ہے۔ مذکورہ اعتراض دراصل اسی قدیم دور کی ایک یادگار ہے۔ یہ اعتراض دراصل توہماتی افکار کی کنڈیشننگ کے تحت پیدا ہوا، جو روایتی طور پر اب تک چلا جا رہا ہے۔

قدیم تو ہماتی دور میں بہت سے ایسے خیالات رائج ہوگئے، جو حقیقت کے اعتبار سے بے بنیاد تھے۔ سائنسی دور آنے کے بعد ان خیالات کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مثلاً شمسی نظام کے بارے میں قدیم جیوسنٹرک (geocentric) تھیوری ختم ہوگئی، اور اس کی جگہ ہیلیو سنٹرک (heliocentric) تھیوری آ گئی۔ اسی طرح ماڈرن کیمسٹری کے ظہور کے بعد قدیم آلکیمی (alchemy) ختم ہوگئی۔ اسی طرح ماڈرن اسٹرانومی (astronomy) کے ظہور کے بعد قدیم اسٹرالوجی (astrology) کا خاتمہ ہوگیا، وغیرہ۔ مذکورہ اعتراض بھی اسی نوعیت کا ایک اعتراض ہے، اور اب یقینی طور پر اس کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔

گلیلیو سترھویں صدی عیسوی کا اٹیلین سائنٹسٹ تھا۔ اس نے قدیم ٹالمی (ptolemy) کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہا کہ زمین شمسی نظام کا سنٹر نہیں ہے، بلکہ زمین ایک سیارہ ہے، جو سورج کے گرد مسلسل گھوم رہا ہے۔ یہ نظریہ مسیحی چرچ کے عقیدے کے خلاف تھا۔ اس وقت مسیحی چرچ کو پورے یورپ میں غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ مسیحی عدالت (inquisition) میں گلیلیو کو بلایا گیا، اور سماعت کرنے کے بعد اس کو سخت سزا دی گئی۔ بعد کو اس کی سزا میں تخفیف کر کے اس کو اپنے گھر میں نظر بند (house arrest) کر دیا گیا۔ گلیلیو اسی حال میں 8 سال تک رہا، یہاں تک کہ 1642ء میں وہ اندھا ہو کر مر گیا۔

جیوسینٹرک نظریہ اب سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس واقعے کے تقریباً 400 سال بعد مسیحی چرچ نے اپنے عقیدے پر نظر ثانی کی۔ اس کو محسوس ہوا کہ گلیلیو کا نظریہ صحیح تھا، اور مسیحی چرچ کا عقیدہ غلط تھا۔ اس کے بعد مسیحی چرچ نے سائنٹفک کمیونٹی سے معافی مانگی، اور اپنی غلطی کا اعلان کر دیا۔

خدا کا فلسفیانہ تصور

آرین مذاہب میں وحدتِ وجود (monism) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق، خدا کا اپنا کوئی فارم نہیں ہے۔ وہ ایک نراکار خدا (formless God) ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا کی اپنی کوئی الگ ہستی نہیں ہے۔ دنیا میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، وہ سب کی سب اِسی بے وجود خدا کا وجودی اظہار ہیں۔ یہ تصور دراصل ایک فلسفیانہ تصور ہے۔ فلاسفہ عام طور پر اِسی معنیٰ میں خدا کو مانتے رہے ہیں۔ وہ خدا کو اسپرٹ (spirit) یا آئیڈیا (idea) جیسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہی فلسفیانہ تصور آرین مذاہب میں ایک عقیدے کے طور پر شامل ہوگیا۔

خدا کا یہ غیر وجودی تصور محض ایک بے بنیاد قیاس (speculation) ہے۔ حقیقی معنوں میں اس کی کوئی استدلالی بنیاد موجود نہیں۔ پہلی بات یہ کہ تخلیق کی صورت میں ہم جس کائنات کا تجربہ کرتے ہیں، وہ پورے معنوں میں ایک فارم (form) ہے۔

یہ کہنا ایک غیر منطقی بات ہے کہ ایک خدا جو محض ایک اسپرٹ یا آئڈیا تھا جس کی اپنی کوئی ہستی نہ تھی، اس نے اتنے بے شمار قسم کے فارم پیدا کردیے۔ خدا وہی ہے جس کے اندر تخلیق کی صفت پائی جاتی ہو، اور اسپرٹ یا آئڈیا میں تخلیق کی صفت سرے سے موجود نہیں۔ اِس لیے یہ نظریہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، اس کی تمام چیزیں ایٹم سے مرکب ہیں۔ اس کو لے کر کہا جاتا ہے کہ سائنس کے مطالعے سے کائنات میں وحدت (oneness) کا ثبوت ملتا ہے، یعنی تمام مادی چیزوں میں استثنا کے باوجود یکسانیت (uniformity amids exception) مگر یہ استدلال درست نہیں۔ کائنات میں مادّی اجزا کے اعتبار سے ضرور وحدت ہے، لیکن اِن مادی اجزا کی ترکیب سے جو چیز بنی، اس کے اندر غیر معمولی ڈزائن (design) موجود ہے، اور ڈزائن صرف ایک ذہن کی تخلیق ہوتی ہے، نہ کہ کسی بے فارم اسپرٹ کی تخلیق۔

کائنات میں خدا کی گواہی

خدا کا ثبوت

اگر ایک انسان کا وجود ہے تو ایک خدا کا وجود کیوں نہیں۔ اگر ہوا اور پانی، درخت اور پتھر، چاند اور ستارے موجود ہیں تو ان کو وجود دینے والے کا وجود مشتبہ کیوں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی موجودگی تخلیق کے عمل کا ثبوت ہے، اور انسان کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک ایسا خالق موجود ہے جو دیکھے اور سنے۔ جو سوچے اور واقعات کو ظہور میں لائے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ پھر کسی چیز کو ماننے کے لیے دیکھنے کی شرط کیوں ضروری ہے۔

آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ وہ ستاروں کو دیکھ رہا ہے۔ حالاں کہ خالص علمی اعتبار سے یہ صحیح نہیں۔ جب ہم ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ہم ستاروں کو براہِ راست نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ان اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، جو ستاروں سے جدا ہو کر کروروں سال کے بعد ہماری آنکھوں تک پہنچے ہیں۔

یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز جس کو انسان ''دیکھ'' رہا ہے۔ وہ صرف بالواسطہ طور پر اسے دیکھ رہا ہے۔ براہِ راست طور پر انسان کسی چیز کو نہیں دیکھتا، اور نہ اپنی موجودہ محدودیت کے ساتھ کبھی دیکھ سکتا ہے۔ پھر جب دوسری تمام چیزوں کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر مانا جاتا ہے تو خدا کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر کیوں نہ مانا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اتنا ہی ثابت شدہ ہے، جتنا کہ اس دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس دنیا کی ہر چیز بالواسطہ دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز اپنے اثرات کے ذریعے سے پہچانی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی نوعیت خدا کے وجود کی بھی ہے۔

خدا یقیناً براہِ راست ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر خدا اپنی نشانیوں کے ذریعے یقیناً دکھائی دیتا ہے، اور بلا شبہ خدا کے علمی ثبوت کے لیے یہی کافی ہے۔

کائنات میں خدا کی گواہی

زمین پر زندگی کے وجود کے لیے مختلف پیچیدہ حالات کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ زمینی ظاہرہ ریاضیاتی طور پر ان مختلف پیچیدہ حالات کے اتفاقی وقوع کے تصور کو ناقابل قبول بناتا ہے، یعنی یہ ناممکن ہے کہ ایسے پیچیدہ حالات اپنے مخصوص تناسب کے ساتھ محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہوجائیں۔ اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے، جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر اس کے باوجود ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجیے۔ اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہوجاتی۔ مثلاً یہ کرۂ زمین اگر چاند جتنا چھوٹا ہوتا یعنی اس کا قطر (diameter) موجودہ کی نسبت سے 1/4 ہوتا تو اس کی کشش ثقل، زمین کی موجودہ کشش کا 1/6 رہ جاتی۔ کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوجاتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے۔ چاند پر اِس وقت نہ تو پانی ہے، اور نہ کوئی ہوائی کرہ۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہوجاتا ہے، اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اسی طرح کم جسامت کی زمین کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی، جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ زمین کی اسی خصوصیت کی بنا پر ایک سائنسداں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ (great balance wheel) کا نام دیا ہے (*Man Does not Stand Alone*, p. 28)۔

اسی طرح اگر یہ ہوتا کہ ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہوجاتا تو زمین کی حالت یہ ہوتی کہ اس کی سطح پر درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا تو انتہائی حد تک بڑھ جاتا، اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس

کے برعکس اگر زمین کا قطر، موجودہ قطر کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کششِ ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی۔ کشش کے اس اضافے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ 15 تا 30 پونڈ کا اضافہ ہو جاتا، جس کا ردِ عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا، اور اگر زمین سورج سے اتنی بڑی ہوتی، اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔

زمین کے گرد گیسوں کا ایک غلاف (Atmosphere) ہے۔ اس کو عام زبان میں ہوا (air) کہا جاتا ہے۔ اس کی وسعت پانچ سو میل کی ہے۔ اگر زمین پر ہوا کے غلاف کی موٹائی گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار سو میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زمین میں زندہ اجسام کا نشو ونما ممکن نہ رہتا۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا۔ انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا، اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجے کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بہ ظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے، جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکا کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکا میں کھڑا ہو تو ہندستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہیے جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ زمین کے اندر غیر معمولی قوتِ کشش ہے، جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے۔ اس دوطرفہ

عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کے ذریعے جو دباؤ پڑتا ہے، وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دباؤ۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے اسی لیے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں، جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدے اور مطالعے سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔

وائٹ ہیڈ (Alfred North Whitehead [1861-1947]) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے: ''نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی۔ ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا۔ تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں۔ جب کہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا''۔ (*The Age of Analysis*, p. 85)

وائٹ ہیڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحبِ شعور کے زیر انتظام نہیں ہے تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے، اور یہ بالکل ممکن ہے، ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ دن اور رات کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا، اور جو بچے گا

وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے (frost) کی نذر ہوجائے گا۔ سورج جو اس وقت ہمارے لیے زندگی کا سرچشمہ ہے، اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے، اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے، مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے، اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہوجائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی، جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے، جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنادیتا۔

زمین 23 درجے کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہوگیا ہے، اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین (South Pole & North Pole) پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے، اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہوجاتی — یہ کس قدر ناقابلِ قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کرلیا۔

اگر سائنسدانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجۂ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک زمین کا درجۂ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے۔ اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا۔ اس کے بعد کروروں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک بلین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔

زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا، ایک حصے نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا، جس کا بیشتر جزء آکسیجن اور نائٹروجن ہے۔ یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے — کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں، یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ نسبت سے ہوا کی مقدار زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں ہو سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو و نما پا سکے۔

زمین کی دوہری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب (meteorite) جو ہر روز اوسطاً دو کرور کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں، اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے۔ یہ شہابیے (meteorites) چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار سے آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی۔ مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت (thickness) کی وجہ سے ہم کو اس آتشی بوچھار (fiery onslaught) سے محفوظ رکھتا ہے۔

ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیاوی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (actinic rays) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لیے ضرورت ہے، جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ — کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً 78 فیصدی نائٹروجن اور 21 فیصدی آکسیجن ہے۔ باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے۔ موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا 8/10 حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لیے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اور اس مقصد کے لیے اس کو فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں، اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لیے ضروری تھا۔ مثال کے طور پر آکسیجن اگر 21 فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جزو ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری (inflammability) کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی۔ مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر زندگی قائم ہے۔ اس کا ایک فی ارب (1 in 1,000,000,000) بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکھٹا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعیات کے الفاظ میں — سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے:

> Science has no explanation to offer for the facts, and to say it is accidental is to defy mathematics (p. 33)

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں، جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (density) پانی سے کم ہوتی ہے۔ پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا۔ ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے برف فوراً پگھل جاتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب امریکا میں انڈوتھیا (Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (Chestnut) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی، اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا: ''یہ شگاف اب پر نہیں ہوں گے''۔ امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا۔ اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لیے خاص تھے۔ یہاں تک کہ 1900ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا۔ اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب جنگلات میں یہ درخت ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے۔ کچھ دوسرے درخت (Tulip Trees) اپنی نشوونما کے لیے شاید انھیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی جزو تھے، اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے۔ لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں۔ اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے

علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے۔ ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لیے بوئی گئی ہے۔ آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا۔ اور زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی، جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابلِ تسخیر فوج پر قابو پالیا، اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہوگیا — قدرت کے نظام میں یہ ضبط وتوازن (checks and balances) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں۔

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے۔ یہ جامد بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے۔ "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے، اس کا ایک ہی مطلب ہوگا — ایک ایسا مرکب جس میں 11.1 فی صد ہائیڈروجن اور 88.9 فی صد آکسیجن۔ ایک سائنسداں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش 100 سنٹی گریڈ ہے جب تک ہوا کا دباؤ (atmospheric pressure) 760 ایم — ایم رہے۔ اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو لانے کے لیے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ 760mm سے زیادہ ہوتو نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہوجائے گا۔ یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جاسکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے۔ اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعیات کے لیے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریقِ عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر میں نظم اور دَوری ضابطہ (Periodic Law) ہے۔ سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Dmitri Mendeleev [1834-1907]) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دَوری نقشہ (periodic chart) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے نقشے میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پُر ہوگئے، ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کیے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کردیتی ہے۔

ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین۔ مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لیے ممکن ہوسکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ نظم وترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ عنصر نمبر 101 کی شناخت محض اس کے 17 پروٹونوں کے مطالعہ سے کرلی گئی۔ قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دَوری اتفاق (periodic chance) نہیں کہتے بلکہ اس کو دَوری ضابطہ (periodic law) کہتے ہیں۔ مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کردیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک

لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

مثال کے طور پر ''11 اگست 1999ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوا، جو انگلینڈ کے کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا گیا'' — لیکن اس کی قیاسی پیشین گوئی پہلے کر دی گئی تھی۔ اس لیے یورپ میں دیکھا گیا 1999ء کا مکمل سورج گرہن تاریخ میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا سورج گرہن تھا۔ سائنسدانوں سمیت بہت سے لوگ اس سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے لیے دور دراز سے سفر طے کر کے گرہن زدہ خطے میں پہنچے تھے۔ اسی طرح 22 جولائی 2009ء کو لگنے والا گرہن اکیسویں صدی کا طویل ترین سورج گرہن تھا، جس کا دورانیہ ساڑھے پانچ گھنٹے تھا۔ اسے پاکستان، بھارت اور چین میں دیکھا گیا۔ اس قسم کا طویل سورج گرہن اس کے بعد 123 سال بعد 2132ء میں دیکھا جا سکے گا۔

علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت متعین وقت اور تاریخ میں اس قسم کے گرہن کا پیش آنا یقینی ہے۔ جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں، وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط (space) میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک بے مثال نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریۂ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں برٹش سائنٹسٹ جے سی ایڈمس (John Couch Adams [1819-1892]) اور فرنچ سائنٹسٹ لاویرے (Urbain Jean Joseph Le Verrier [1811-1877]) کو وہ بنیاد ملی، جس سے وہ دیکھے بغیر صرف ریاضیاتی بنیادوں پر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کر سکیں، جو اس وقت

تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر 1846ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو اب ہم نیپچون (Neptune) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر نا قابلِ قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہے۔

☆☆☆☆☆

لیوس ٹامس (Lewis Thomas) ایک امریکی سائنس داں اور فلسفی ہے۔ اس کی پیدائش 1913 میں ہوئی، اور وفات 1993 میں ہوئی۔ بائیولوجی پر اس کی ایک کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس نے زمین کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں — وہ خلا میں لٹکا ہوا، اور بظاہر ایک زندہ کرہ ہے:

> hanging there in space and obviously alive. (Lewis Thomas, The Fragile Species, Collier, 1993, p. 135)

یہ زمین (planet earth) کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ زمین ایک اتھاہ خلا (vast space) میں مسلسل گردش کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ زمین کے جو احوال ہیں، وہ انتہائی استثنائی طور پر ایک زندہ کرہ کے احوال ہیں۔ یہ چیزیں اتنی حیرت ناک ہیں کہ اگر ان کو سوچا جائے، تو رونگٹے کھڑے ہوجائیں، اور بدن میں کپکپی طاری ہوجائے۔ زمین میں اور بقیہ کائنات میں اتنی زیادہ نشانیاں ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان میں سنجیدگی سے (sincerely) غور کرے، تو یہ کائنات اس کے لیے خدا کی معرفت اور جلال و جمال کا آئینہ بن جائے۔

ذہین کائنات

نظام شمسی سورج اور ان تمام غیر روشن اجرام فلکی کے مجموعے کو کہتے ہیں، جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سورج کی ثقلی گرفت (gravitational pull) میں ہیں، اور سورج کے ارد گرد اپنے مخصوص مدار میں گھوم رہے ہیں۔ معلوم نظام شمسی ابھی تک صرف ایک ہے، جس میں ہماری زمین واقع ہے۔ تاہم علمائے فلکیات کا قیاس ہے کہ اس قسم کے مزید ایک ملین نظام شمسی کائنات میں ہو سکتے ہیں۔

کہکشاں اس مجموعے کو کہتے ہیں جس میں روشن ستارے ایک خاص نظام کے اندر گردش کر رہے ہیں۔ ہماری قریبی کہکشاں (Milky Way) جو رات کے وقت لمبی سفید دھاری کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، اس کے اندر تقریباً ایک کھرب ستارے ہیں۔ ہمارا نظام شمسی (solar system) اسی میں واقع ہے۔

سورج ہماری کہکشاں کی پلیٹ پر اپنے تمام سیاروں کو لیے ہوئے 175 میل فی سکنڈ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے۔ یہ کہکشاں اتنی وسیع ہے کہ سورج کے اس تیز رفتار سفر کے باوجود کہکشاں کے مرکز کے گرد ایک چکر کو پورا کرنے میں ہمارے نظام شمسی کو 20 کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس قسم کی ایک بلین سے زیادہ کہکشائیں وسیع کائنات میں پائی جاتی ہیں، اور ہر کہکشاں کے اندر کئی بلین انتہائی بڑے بڑے ستارے موجود ہیں۔

کہکشاں کے اندر ستارے انتہائی بعید فاصلوں پر واقع ہیں۔ ہمارے سورج سے قریب ترین ستارے کی روشنی جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہو، زمین تک اس کے پہنچنے میں 4 سال سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

اجرامِ سماوی کے اتنے بڑے نظام کو کیا چیز تھامے ہوئے ہے، فلکیات دانوں کے نزدیک وہ اجرام سماوی کی باہمی کشش ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ''اجرام سماوی کی باہمی کشش'' کے لفظ کی معنویت کو آدمی سمجھ لیتا ہے۔ مگر ''خدا'' کے لفظ کی معنویت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔

معنی خیز استثنا

کائنات میں بے شمار الگ الگ چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن کائنات کا ایک عجیب ظاہرہ یہ ہے کہ اس میں عمومی طور پر یکسانیت (uniformity) نہیں ہے، بلکہ اُس کے ہر حصے میں استثناءات (exceptions) پائے جاتے ہیں۔ کائنات کی یہ استثنائی مثالیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔ استثنا (exception) ذہین مداخلت (intelligent intervention) کا ثبوت ہے، اور ذہنی مداخلت ایک ذہین خالق (Intelligent Creator) کا ثبوت ہے۔

مثلاً وسیع کائنات میں شمسی نظام (solar system) ایک استثنا ہے۔ شمسی نظام میں سیارۂ ارض (planet earth) ایک استثنا ہے۔ زمین کا انتہائی متناسب سائز ایک استثنا ہے۔ زمین کی اپنے محور (axis) پر گردش ایک استثنا ہے۔ زمین پر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ایک استثنا ہے۔ زمین پر زندگی ایک استثنا ہے۔ زمین پر انسان ایک استثنا ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کے مختلف استثنا جو ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں، وہ سادہ طور پر صرف استثنا نہیں ہیں، بلکہ وہ انتہائی حد تک بامعنی استثنا (meaningful exception) ہیں۔ وسیع کائنات میں اِس قسم کے بامعنٰی استثناءات یقینی طور پر اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اُس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اِس کائنات کو بنایا ہے۔ اُس نے جہاں چاہا، چیزوں میں یکسانیت (uniformity) کا طریقہ اختیار کیا، اور جہاں چاہا، کسی چیز کو دوسری چیزوں سے ممیّز اور مستثنیٰ بنا دیا۔

مثلاً زندہ اجسام کے ڈھانچے میں باہم یکسانیت (uniformity) پائی جاتی ہے، لیکن اِسی کے ساتھ ہر ایک کا جنیٹک کوڈ (genetic code) ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، لیکن ہر ایک کے انگوٹھے کا نشان (thumb impression) ایک دوسرے سے الگ ہے۔ یکسانیت کے درمیان یہ استثنا یقینی طور پر ایک ذہین تخلیق (intelligent creation) کا ثبوت ہے، نہ کہ اندھے اتفاقات کا نتیجہ۔

کائناتی نشانیاں

ایس ٹی کالرج (1772-1834) ایک مشہور انگریزی تنقید نگار، فلاسفر اور شاعر ہے۔ اس کی ایک نظم کا عنوان ہے:

The Rhyme of the Ancient Mariner

اس نظم میں شاعر نے دکھایا ہے کہ ایک ملاح اپنے کسی گناہ کے سبب سمندر میں پھنس گیا ہے۔ اس کے پاس پینے کے لیے میٹھا پانی نہیں ہے۔ کشتی کے چاروں طرف سمندر کا پانی پھیلا ہوا ہے۔ مگر کھاری ہونے کی وجہ سے وہ ان کو پی نہیں سکتا۔ وہ پیاس سے بے تاب ہو کر کہتا ہے — ہر طرف پانی ہی پانی، مگر ایک قطرہ نہیں جس کو پیا جا سکے:

Water, water everywhere/Nor any drop to drink.

جو حال کالرج کے خیالی ملاح کا ہوا، وہی حال امکانی طور پر اس دنیا میں تمام انسانوں کا ہے۔ انسان پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر پانی کا تمام ذخیرہ سمندروں کی صورت میں ہے، جن میں 1/10 حصہ نمک ملا ہوا ہے۔ اس بنا پر سمندر کا پانی اتنا زیادہ کھاری ہے کہ کوئی آدمی اس کو پی نہیں سکتا۔

اس کا حل قدرت نے بارش کی صورت میں نکالا ہے۔ سورج کی گرمی کے اثر سے سمندروں میں تبخیر (evaporation) کا عمل ہوتا ہے۔ سمندر کا پانی بھاپ بن کر فضا کی طرف اٹھتا ہے، مگر مخصوص قانونِ قدرت کے تحت اس کے نمک کا جزء سمندر میں رہ جاتا ہے، اور صرف میٹھے پانی کا جزء اوپر جاتا ہے۔ یہی صاف کیا ہوا پانی بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر برستا ہے، اور انسان کو میٹھا پانی عطا کرتا ہے، جس کی انسان کو سخت ترین ضرورت ہے۔

بارش کا عمل ازالۂ نمک (desalination) کا ایک عظیم آفاقی عمل ہے۔ آدمی اگر صرف اس ایک واقعے پر غور کرے تو اس پر ایسی کیفیت طاری ہو کہ وہ خدا کے کرشموں کے احساس سے رقص کرنے لگے۔

کویزار — ایک ارب سورج سے بھی زیادہ روشن

فلکیات (astronomy) میں اجرامِ فلکی (مثلاً، چاند، سیارے، ستارے، نیبولا، گلیکسی، وغیرہ)، اورزمینی کرۂ ہوا کے باہر رُونما ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ برسات کے موسم میں جب فضا بالکل صاف ہوتی ہے، آسمان پر لمبے روشنی کے بادل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہماری کہکشاں (Galaxy) ہے، جس کا نام ملکی وے (Milky Way) ہے۔ اس کے اندر ہمارا سولر سسٹم واقع ہے۔ روشنی کے بادل حقیقت میں بادل نہیں ہیں، بلکہ بے شمار ستاروں کے مجموعے ہیں، جو دور ہونے کی وجہ سے ملے ملے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر آپ دوربین (telescope) سے دیکھیں تو بادل کے بجائے آپ کو الگ الگ ستارے دکھائی دیں گے۔ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا سورج بہ ظاہر بہت بڑا نظر آتا ہے۔ مگر کہکشاں کے اکثر ستارے اس سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار کہکشانی مجموعے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً فلکیات کی حیران کُن دریافتوں میں سے ایک وہ ہے، جس کو کویزار (Quasar) کہا جاتا ہے:

Quasar, an astronomical object of very high luminosity found in the centres of some galaxies and powered by gas spiraling at high velocity into an extremely large black hole. The brightest quasars can outshine all of the stars in the galaxies in which they reside, which makes them visible even at distances of billions of light-years. Quasars are among the most distant and luminous objects known.

(www.britannica.com/science/quasar [accessed on 02.04.2020])

کویزار زمین سے دور دراز فاصلے پر واقع ایک آسمانی جِرم (object) ہے، جس سے ریڈیائی لہریں کثیر مِقدار میں نکلتی ہیں۔ کائنات کے انتہائی بعید کناروں پر واقع یہ شبہ ستارے بے حد روشن ہیں۔ ایک پوری کہکشاں جس میں سورج یا اس سے بڑے بڑے ایک ارب ستارے ہوں، جتنی انرجی (روشنی اور حرارت) خارج کرتی ہے، اتنی زیادہ انرجی (energy) تنہا ایک کویزار خارج کرتا ہے۔

اس قسم کے ستارے وسیع خلا (space) میں سیکڑوں کی تعداد میں معلوم کیے گئے ہیں۔ مزید عجیب بات یہ پائی گئی ہے کہ یہ ستارے اکثر جوڑے جوڑے ہیں، جو ایک دوسرے کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کائنات میں انرجی پیدا ہونے کا سب سے طاقت ور عمل جواب تک سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے، وہ تھرمونیوکلیر ری ایکشن (Thermonuclear Reaction) ہے۔ مگر کویزار سے خارج ہونے والی بے پناہ طاقت کی توجیہہ کے لیے وہ ناکافی ہے۔ قیاس ہے کہ کویزار میں انرجی پیدا ہونے کا طریقہ مکمل طور پر کوئی دوسرا طریقہ ہے، جو دیگر ستاروں میں نہیں پایا جاتا۔

> A quasar (also known as a quasi-stellar object[QSO]) is an extremely luminous active galactic nucleus (AGN), in which a supermassive black hole with mass ranging from millions to billions of times the mass of the Sun is surrounded by a gaseous accretion disk. As gas in the disk falls towards the black hole, energy is released in the form of electromagnetic radiation, which can be observed across the electromagnetic spectrum. The power radiated by quasars is enormous: the most powerful quasars have luminosities thousands of times greater than a galaxy such as the Milky Way.
> (www.en.wikipedia.org/wiki/Quasar [accessed on 02.04.2020])

نعمتوں سے بھری ہوئی یہ زمین اللہ کے جمال کی مظہر (manifestation of beauty) ہے، اور خلا (space) کے دہشت ناک ستارے اللہ کے جلال کا مظہر (manifestation of majesty) ہیں۔ لائف سپورٹ سسٹم والی یہ زمین اگر جنتی زندگی کی علامت ہے تو ستاروں (stars) کی شکل میں دہکتے ہوئے شعلے جہنم کی یاد دلاتے ہیں۔ آدمی اگر زمین وآسمان کی ان نشانیوں (signs) پر غور کرے تو اس کا سینہ خدا کی یاد سے بھر جائے گا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (3:190)۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔

عقیدۂ خدا اور سائنس

سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین اسی علم فطرت کا ظہور ہے، جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے— سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی ہم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ حق ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کائنات کی جونئی تصویر بنی ہے، وہ عین وہی ہے، جو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے جدید سائنسی دریافتیں گویا کتابِ الٰہی کے اشارات کی تفصیل ہیں، اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید دریافت کے مطابق، کائنات کی ابتدا تقریباً 13.8 بلین سال پہلے ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تدریجی انقلابات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ اس پورے سفر کی روداد اس موضوع کی کتابوں میں پڑھ کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو محسوس طور پر کسی سائنسی پلینٹیریم (Planetarium) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے یہ پورا منظر واشنگٹن کے نیشنل پلینٹیریم میں دیکھا ہے۔

سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ 13.8 بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر ایٹم ظاہر ہوا۔ یہ ان تمام ذرات (particles) کا مجموعہ تھا، جو موجودہ کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ گویا موجودہ پوری کائنات ایک بہت بڑے فٹ بال جیسے گولے کی صورت میں شدت کے ساتھ باہمی طور پر چمٹی ہوئی تھی۔ اس گولے کے تمام ذرات بے حد طاقت ور کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے داخلی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ معلوم طبیعیاتی قانون کے مطابق، یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیرونی سمت میں سفر کریں۔

اس وقت اس سُپر ایٹم کے اندر نہایت طاقتور دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد سپر ایٹم کے ذرات بکھر کر تیزی سے بیرونی سمت میں سفر کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ذرات وسیع خلا میں

مختلف مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہوگئے۔ انھیں مجموعوں سے خلا میں پائی جانے والی وہ دنیائیں بنیں، جن کو ستارہ، سیارہ، کہکشاں، شمسی نظام، زمین اور چاند جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سپر ایٹم کا یہ دھماکہ بیک وقت دو چیزیں ثابت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ یہاں کائنات سے الگ ایک طاقتور ہستی پہلے سے موجود تھی، جس نے اپنی ارادی مداخلت کے ذریعے یہ غیر معمولی واقعہ کیا کہ سپر ایٹم کے ذرات داخلی رخ پر سفر کے بجائے بیرونی رُخ پر سفر کرنے لگے۔

اس واقعے کا دوسرا عظیم پہلو یہ ہے کہ دھماکہ (explosion) ہمیشہ تخریبی نتائج کا سبب بنتا ہے۔ پٹاخہ سے لے کر بم تک ہر دھماکہ بلا استثنا یہی خاصیت رکھتا ہے۔ مگر سُپر ایٹم کا دھماکہ استثنائی طور پر غیر تخریبی تھا۔ اس نے مکمل طور پر صرف صحت منداور تعمیری نتائج پیدا کیے۔ یہ استثنائی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خالق لامحدود قدرت کا مالک ہے۔ وہ یہ استثنائی اختیار رکھتا ہے کہ واقعے کے ساتھ نتائج پر مکمل کنٹرول کر سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے۔ وہ غبارہ کی مانند مسلسل طور پر بیرونی سمت میں پھیل رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز ہے۔ اگر کائنات ابدی ہوتی تو وہ اپنی اس پھیلتی ہوئی نوعیت کی بنا پر اب تک ختم ہوچکی ہوتی۔ یہ ثابت ہونا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے، یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز کرنے والا ہے۔ ایک غیر موجودہ چیز کا آغاز اسی وقت ممکن ہے، جب کہ اس سے پہلے کوئی موجود ہو، جو اپنے ارادے سے اُس کا آغاز کر سکے۔

کائنات میں ایسے بے شمار شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا منصوبہ ساز اور اس کا ناظم صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ناظم ہوتے تو یقینی طور پر کائنات میں فساد برپا ہوجاتا۔

مثال کے طور پر زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً 9 کرور 30 لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ مسلسل طور پر اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ اگر اس فاصلہ میں تبدیلی آجائے تو اس کے مہلک نتائج پیدا ہوں گے۔ مثلاً اگر یہ فاصلہ بڑھ کر 20 کرور میل دور ہوجائے تو زمین پر اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ پانی، حیاتیات، حیوانات اور انسان سب منجمد ہوجائیں۔ اسی طرح یہ فاصلہ اگر کم ہو کر 5 کرور میل ہوجائے تو

زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ تمام چیزیں بشمول انسان جل کر ختم ہو جائیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور زمین دونوں کا خدا ایک ہے۔ اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوتے تو دونوں الگ الگ اپنی مرضی چلاتے اور پھر یقینی طور پر یہ فاصلہ گھٹتا یا بڑھتا رہتا اور اس بے قاعدگی کی بنا پر زمین پر انسانی تہذیب کا وجود ناممکن ہو جاتا۔

نامعلوم حد تک وسیع کائنات میں ہمارا زمینی سیارہ ایک نادر استثنا ہے۔ یہاں پانی اور ہوا اور نباتات جیسی ان گنت چیزیں پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جب کہ وسیع خلا میں معلوم طور پر کوئی بھی ایسی دنیا موجود نہیں جہاں بقائے حیات کا یہ سامان پایا جاتا ہو۔ یہ استثنا بتاتا ہے کہ یہ دنیا محض بے شعور مادہ کے ذریعہ نہیں بنی۔ بلکہ وہ ایک باشعور ہستی کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ اگر وہ محض مادی قوانین کے بے شعور تعامل کا نتیجہ ہوتی تو کائنات میں بہت سی ایسی زمینیں ہوتیں، نہ کہ صرف ایک ایسی زمین۔

ہماری دنیا کی ہر چیز انتہائی حد تک بامعنی ہے۔ چیزوں کی معنویت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک باشعور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کوئی دوسرا نظریہ اس حکمت اور معنویت کی توجیہہ نہیں کرسکتا۔

مثلاً زمین کے حجم (size) کو لیجیے۔ زمین کا موجودہ حجم تقریباً 25 ہزار میل کی گولائی میں ہے۔ یہ حجم بے حد بامعنی ہے۔ چنانچہ یہ حجم اگر 50 ہزار میل ہوتا تو زمین کی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ وہ انسانی جسم کی بڑھوتری کو روک دیتی۔ اس کے بعد زمین پر صرف بالشتیے قسم کے انسان (dwarf) دکھائی دیتے۔ اس کے برعکس اگر زمین کا حجم گھٹ کر 12 ہزار میل ہوتا تو اس کی قوتِ کشش اتنی کم ہو جاتی کہ وہ انسانی بڑھوتری کو روک نہ سکتی۔ انسان کا قد تاڑ (palm) کی طرح لمبا ہو جاتا۔ اس کے سوا اور بے شمار قسم کے غیر موافق حالات پیدا ہوتے جو انسان کی تمام تمدنی ترقیوں کو ناممکن بنا دیتے۔

مذکورہ پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، اور وہ یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لیے جو انتخاب ہے، وہ باخدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے لیے حقیقی انتخاب باخدا کائنات

(universe with God)اور غیر موجود کائنات(no universe at all) میں ہے۔یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔اس معاملے میں ہمارے لیے دوسرا ممکن انتخاب موجود نہیں۔

☆☆☆☆☆

دریافت کی اہمیت

انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز دریافت ہے۔ دریافت ہی سے دنیا کی ترقیاں بھی ملتی ہیں، اور دریافت ہی سے آخرت کی ترقیاں بھی۔قرآن کا مطلوب انسان وہ ہے، جو غیب پر ایمان لائے (البقرۃ،2:3)۔غیب پر ایمان لانا کیا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں نامعلوم کو معلوم بنانا ہے۔یعنی وہی چیز جس کو موجودہ زمانے میں دریافت(discovery) کہا جاتا ہے۔

دنیوی ترقی کے رازوں کو خدا نے زمین وآسمان کے اندر چھپا دیا ہے۔ان رازوں کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کہا جاتا ہے۔سائنس میں انھیں رازوں (یا قوانین فطرت) کو دریافت کیا جاتا ہے۔جو قوم ان رازوں کو دریافت کرے وہ دوسروں سے آگے بڑھ جاتی ہے۔جیسا کہ موجودہ زمانے میں ہم مغربی اقوام کو یا ایشیا میں جاپان کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ترقی یافتہ قوموں (developed countries) کو تمام ترقیاں انھیں دریافتوں کی بنیاد پر حاصل ہوئی ہیں۔

اسی طرح عالم آخرت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔اب انسان کو اسے دریافت کرنا ہے۔جو چیز غیب میں ہے اس کو شہود میں لانا ہے۔اسی دریافت یا اکتشاف کا نام ایمان ہے۔جو شخص اس ایمان میں جتنا زیادہ آگے ہوگا، وہ آخرت میں اتنا ہی زیادہ ترقی اور کامیابی حاصل کرے گا۔

کائناتی وحدت

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات ایک مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایٹم کا ایک نیوکلیس (nucleus) ہے، اور ایٹم کا ایک پورا ڈھانچہ اس نیوکلیس کے گرد گھومتا ہے۔ شمسی نظام کا مرکز سورج ہے اور اس کے تمام سیارے اور سیارچے مسلسل اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح کہکشاں کا ایک مرکز ہے اور کہکشاں کے اربوں ستارے اس مرکز کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری کائنات کا ایک مرکز ہے، اور پوری پھیلی ہوئی کائنات اپنی ذیلی حرکتوں کے ساتھ اس آخری مرکز کے گرد حرکت کر رہی ہے۔ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ کائناتی مرکز ایک روز اپنے گرد کی تمام چیزوں کو کھینچنا شروع کرے گا، اور پھر یہ ناقابلِ قیاس حد تک پھیلی ہوئی عظیم کائنات اپنے مرکز کی طرف سمٹنا شروع ہوگی، اور بالآخر وہ وقت آئے گا کہ سارے کائناتی اجسام اس طرح سمٹ کر ایک مرکزی گولے کی صورت اختیار کرلیں گے، جیسے بکھری ہوئی کیلوں کے درمیان مقناطیس لایا جائے، اور سب کیلیں سمٹ سمٹ کر اس سے جڑ جائیں — كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (21:104)۔

اس طرح کائنات گویا دینِ توحید کا عملی مظاہرہ بن گئی ہے۔ وہ عمل کی زبان میں بتا رہی ہے کہ انسان کی زندگی کو کیسا ہونا چاہیے۔ انسان کی زندگی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا صرف ایک مرکز ہو، اور وہ ایک خدا ہو۔ آدمی کے جذبات، اس کی سوچ، اس کی سرگرمیاں، اس کا سب کچھ خدا کے گرد گھومنے لگیں۔

آدمی اگر اپنی زندگی کا مرکز ومحور اپنی ذات کو بنائے تو کائنات بزبانِ حال اس کو رد کر رہی ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی ذات کے باہر کسی کو اپنی توجہات کا مرکز ومحور بنائے تو موجودہ کائنات کے ڈھانچے میں وہ قابلِ رد قرار پا رہا ہے۔ کائنات کا موجودہ ڈھانچہ ایک ہستی کے سوا کسی دوسرے کی مرکزیت کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ کائنات زبانِ حال سے کہہ رہی ہے — ''ایک'' کو اپنا مرکزِ توجہ بناؤ، نہ کہ ایک کے سوا ''کئی'' کو۔

خدا کی عظمت

خدا کی معرفت ایمان اور اسلام کی اساس (basis) ہے۔ جتنی اعلیٰ معرفت، اتنا ہی اعلیٰ ایمان۔ اس معرفت کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے، جب کہ آپ خدا کو اس کے کمالِ عظمت کے ساتھ دریافت کریں۔ ایک بندہ جب خدا کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (8:2)۔ یعنی خدا کی یاد سے ان کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ جدید فلکیاتی سائنس (modern astronomy) کا اِس معاملے میں ایک مثبت کنٹربیوشن (contribution) یہ ہے کہ اس نے خالق کی ناقابلِ قیاس عظمت کا ادراک کرنے کے لیے ایک فریم ورک (framework) دے دیا ہے۔ اِس فریم ورک کی مدد سے انسان خداوندِ ذوالجلال کی ناقابلِ بیان عظمت کا ایک تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔

جدید سائنس کئی سو سال سے فلکیات کا مطالعہ کررہی ہے۔ اس کا آغاز 1508ء میں دوربین (telescope) کی ایجاد کے بعد ہوا۔ 1609 میں پہلی بار اٹلی کے سائنس داں گلیلیو گلیلی نے خلا کا دوربینی (telescopic) مشاہدہ کیا۔ یہ فلکیاتی مشاہدہ برابر بڑھتا رہا۔ پہلے دوربینی رصدگاہ کسی پہاڑ پر بنائی جاتی تھی۔ اب خلائی سائنس کا زمانہ آگیا ہے۔ اب انسان نے خلائی رصدگاہ (space observatory) بنالی ہے۔ اس کے ذریعے کائنات کا مشاہدہ اتنی زیادہ دور تک کرنا ممکن ہو گیا ہے، جس کی دوری کو صرف سالِ نور (light years) کی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح خدا کی عظمت کو تصور میں لانے کے لیے ایک نیا وسیع تر دائرہ انسان کے علم میں آ گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ ترین فلکیاتی دریافت (discovery) سامنے آئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ خلا میں نصب الکٹرانک دوربینوں کے ذریعے ایک بہت بڑا بلیک ہول دریافت ہوا ہے۔ یہ بلیک ہول پورے نظام شمسی (solar system) کو نگل سکتا ہے۔ نظام شمسی کا دائرہ کتنا زیادہ بڑا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اِس نظام کا بعید ترین سیارہ پلوٹو (Pluto) ہے، جو سورج کے گرد بیضوی دائرہ میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ دائرہ ساڑھے سات بلین میل پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بلیک ہول اب تک کے دریافت کردہ تمام بلیک ہول سے زیادہ بڑا ہے۔ اس کا حجم 6 بلین سورج سے بھی زیادہ ہے۔ اِس بلیک ہول کا نام M87 رکھا گیا ہے۔ یہ بلیک ہول ہماری کہکشاں (Milky Way) سے 50 ملین سال نور کی دوری پر واقع ہے۔

The black hole can eat the solar system

Astronomers have discovered what they say is the biggest ever black hole that weighs the same as 6.8 billion Suns and could swallow our entire solar system. According to the scientists, the black hole, identified as M87, is as large as the orbit of Neptune and is by far the largest and most distant galaxy in the nearby universe. As a point of comparison, the black hole at the centre of the Milky Way is 1,000 times smaller than this one which has been observed some 50 million light years away. (*The Times of India,* New Delhi, Tuesday, January 18, 2011, p. 19)

یہ واقعہ اور اِس طرح کے دوسرے واقعات معرفتِ الٰہی کے لیے عظیم خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ واقعات خدا کی قدرت کو ناقابلِ قیاس حد تک عظیم بنا دیتے ہیں۔ جو آدمی اِن واقعات پر سوچے گا، اس کا دل خدا کی عظمت کے تصور سے دہل اٹھے گا، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ واقعات ایک انسان کو اپنے بارے میں انتہائی عجز اور خدا کے بارے میں انتہائی قدرت کی یاد دلاتے ہیں۔ ان واقعات پر غور کرنا بلاشبہ اعلیٰ معرفت کے حصول کا کائناتی خزانہ ہے۔

معرفت یہ ہے کہ آدمی ایک طرف اپنی محدودیت (limitation) کو جانے اور دوسری طرف وہ خدا کی لامحدودیت کو دریافت کرے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔ یہ معرفت جس کو حاصل ہو جائے، اس کے لیے گویا دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔ یہی وہ خوش قسمت انسان ہے، جس کے بارے میں آخرت میں کہا جائے گا — تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد تمھارے لیے نہ کوئی خوف ہے، اور نہ کوئی حزن۔

عقیدۂ خدا

کائنات کا ایک خدا ہے، جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ اس خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل خود وہ کائنات ہے، جو ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ ایک عظیم خدا ہے، جس نے اس کو بنایا، اور اپنی بے پناہ طاقت سے اس کو چلا رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم کائنات کو مانیں، اور اسی لیے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کو مانیں۔ کیوں کہ کائنات کو ماننا اس وقت تک بے معنی ہے، جب تک اس کے خالق و مالک کو نہ مانا جائے۔ کائنات اتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن نہیں سکتی، اور اس کا نظام اتنا عجیب ہے کہ وہ کسی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے پر آدمی اس طرح مجبور ہے، جس طرح اپنے آپ کو یا کائنات کو ماننے پر۔

آپ سائیکل کے پہیے پر ایک کنکری رکھیں، اور اس کے بعد پیڈل چلا کر پہیے کو تیزی سے گھمائیں تو کنکری دور جا کر گرے گی۔ حالاں کہ سائیکل کے پہیے کی رفتار مشکل سے 25 میل فی گھنٹہ ہے۔ ہماری یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، وہ بھی ایک بہت بڑے پہیے کی مانند ہے۔ زمین اپنے محور پر مسلسل ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ رفتار سواری کے عام ہوائی جہازوں سے زیادہ ہے۔ ہم اس تیز رفتار زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔ گھر اور شہر بناتے ہیں۔ مگر ہمارا وہ حال نہیں ہوتا، جو گھومتے ہوئے پہیے پر رکھی ہوئی کنکری کا ہوتا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ معجزہ۔

سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ زمین پر ہمارے قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے زمین بہت بڑی طاقت کے ساتھ کھینچ رہی ہے، جس کو قوت کشش کہا جاتا ہے، اور اوپر سے ہوا کا بھاری دباؤ ہم کو زمین کی سطح پر روکے رہتا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل ہم کو زمین پر تھامے ہوئے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم پہیے کی کنکری کی طرح فضا میں اڑ نہیں جاتے۔ مگر یہ جواب صرف یہ بتاتا ہے کہ ہمارے آس پاس ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا معجزہ موجود ہے۔ زمین میں اتنے بڑے پیمانے پر کھینچنے کی قوت ہونا،

اور اس کے چاروں طرف ہوا کا پانچ سو میل موٹا غلاف مسلسل لپٹا رہنا صرف معاملے کی حیرت ناکی کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجے میں اس کو کم نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز معجزہ ہے۔ آدمی مٹی کے اندر ایک چھوٹا سا دانہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر وہ دیکھتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ایک ہری اور سفید مولی نکلی چلی آ رہی ہے۔ وہ دوسرا دانہ ڈالتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے میٹھا گاجر نکلا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح بے شمار دوسری چیزیں۔ کسی دانے کو مٹی میں ڈالنے سے امرود نکل رہا ہے۔ کسی دانے کو ڈالنے سے آم۔ کسی دانے سے شیشم کا درخت نکلا چلا آ رہا ہے، اور کسی دانے سے چنار کا درخت۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی صورت الگ، ہر ایک کا مزہ الگ، ہر ایک کے فائدے الگ، ہر ایک کی خاصیتیں الگ۔ ایک ہی مٹی ہے، اور ناقابلِ لحاظ چھوٹے چھوٹے بیج ہیں، اور ان سے اتنی مختلف چیزیں اتنی مختلف صفتوں کو لیے ہوئے نکل رہی ہے، جن کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔

حیرت ناک معجزوں کی ایک پوری کائنات ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سارے انسان مل کر ایک ذرے کی بھی تخلیق نہیں کر سکتے وہاں ہر لمحہ بے شمار طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اتنے بڑے معجزے ہیں کہ ان کے کمالات کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو بتانے کے لیے ہماری لغت کے تمام الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ ہمارے الفاظ ان معجزوں کے اتھاہ کمالات کو صرف محدود کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی ان کا اظہار نہیں کرتے۔ کیا یہ معجزہ ایک خدا کے بغیر خود بخود وجود میں آ سکتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے۔ ہر چیز اپنے آخری تجزیے میں ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ مگر کیسا عجیب معجزہ ہے کہ کہیں ایٹموں کی ایک مقدار جمع ہوتی ہے تو سورج جیسا روشن کرہ بن جاتا ہے۔ دوسری جگہ یہی ایٹم جمع ہوتے ہیں تو وہ بہتے ہوئے پانی کی صورت میں رواں ہو جاتے ہیں۔ تیسری جگہ ایٹموں کا یہی مجموعہ لطیف ہواؤں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی اور جگہ یہی ایٹم زرخیز زمین کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں ان گنت چیزیں ہیں۔ سب کی ترکیب ایٹم سے ہوئی

ہے۔ مگر سب کی نوعیت اور خاصیت جدا جدا ہے۔ اس قسم کی ایک معجزاتی کائنات اپنی بے شمار سرگرمیوں کے ساتھ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ بہت بڑے بڑے پیمانے پر دنیا میں جمع کر دیا گیا ہے، اور ہر روز جمع کیا جا رہا ہے۔ دنیا کو اپنے لیے قابلِ استعمال بنانے کی خاطر انسان کو خود جو کچھ کرنا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے۔ کائناتی انتظام کے تحت بے حساب مقدار میں قیمتی رزق پیدا کیا جاتا ہے۔ ہم اس میں صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنا ہاتھ اور منھ چلا کر اس کو اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ارادے کے بغیر خود کار فطری نظام کے تحت غذا ہمارے اندر تحلیل ہوتی ہے، اور گوشت اور خون اور ہڈی اور ناخن اور بال اور دوسری بہت سی چیزوں کی صورت اختیار کر کے ہمارے جسم کا جزء بن جاتی ہے۔

زمین وآسمان کی بے شمار گردشوں کے بعد وہ حیرت انگیز چیز پیدا ہوتی ہے، جس کو تیل کہتے ہیں۔ انسان صرف یہ کرتا ہے کہ اس کو نکال کر اپنی مشینوں میں بھر لیتا ہے، اور پھر یہ سیال ایندھن انسانی تہذیب کے پورے نظام کو حیرت انگیز طور پر رواں دواں کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے نظام کے تحت وہ ساری چیزیں بے شمار تعداد اور مقدار میں پیدا کی گئی ہیں، جن پر انسان صرف معمولی عمل کرتا ہے، اور اس کے بعد وہ کپڑا، مکان، فرنیچر، آلات، مشینوں، سواریوں اور بے شمار تمدنی ساز وسامان کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔ کیا یہ واقعات اس بات کے ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ اس کا ایک بنانے والا اور چلانے والا ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ قدرت اپنے طویل اور ناقابلِ بیان عمل کے ذریعے ہر قسم کی چیزیں تیار کر کے ہم کو دے رہی ہے۔ انسان ان کو اپنے حق میں کارآمد بنانے کے لیے بے حد تھوڑا حصہ ادا کرتا ہے۔ وہ لوہے کو مشین کی صورت میں ڈھالتا ہے، اور تیل کو صاف کر کے اس کو اپنی گاڑی کی ٹنگی میں بھرتا ہے۔ مگر اس قسم کے معمولی عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ خشکی اور تری فساد سے بھر گئے ہیں۔ قدرت نے ہم کو ایک انتہائی حسین اور خالص دنیا دی تھی۔ مگر ہمارے عمل نے ہم کو دھواں، شور، غلاظت، توڑ پھوڑ، لڑائی جھگڑا اور طرح طرح کے ناقابلِ حل مسائل سے گھیر لیا ہے۔ ہم اپنے کارخانوں

یا تمدّنی سرگرمیوں کی صورت میں جو تھوڑا سا عمل کرتے ہیں، وہی عمل کائنات میں بے حساب گنا زیادہ بڑے پیمانے پر رات دن ہو رہا ہے، مگر یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

زمین مسلسل دو قسم کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ایک، اپنے محور (axis) پر اور دوسری، سورج کے گرد اپنے مدار (orbit) پر، مگر وہ کوئی شور برپا نہیں کرتی۔ درخت ایک عظیم الشان کارخانہ کی صورت میں کام کرتے ہیں مگر وہ دھواں نہیں بکھیرتے۔سمندروں میں بے شمار جانور ہر روز مرتے ہیں مگر وہ پانی کو خراب نہیں کرتے۔کائنات کا نظام کھرب ہا کھرب سال سے چل رہا ہے۔مگر اس کا منصوبہ اتنا کامل ہے کہ اس کو کبھی اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بے شمار ستارے اور سیارے خلا میں ہر وقت دوڑ رہے ہیں۔مگر ان کی رفتار میں کبھی فرق نہیں آتا، وہ کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ یہ تمام معجزوں سے بڑا معجزہ اور تمام کرشموں سے بڑا کرشمہ ہے، جو ہر لمحہ ہماری دنیا میں پیش کیا جا رہا ہے۔کیا اس کے بعد کوئی اور ثبوت چاہیے کہ آدمی اس کائنات کے پیچھے ایک عظیم خدائی طاقت کو تسلیم کرے۔

پھر زندگی کو دیکھیے۔فطرت کا کیسا انوکھا واقعہ ہے کہ چند مادی چیزیں خود بخود ایک جسم میں یک جا ہوتی ہیں، اور پھر ایک ایسی شخصیت وجود میں آجاتی ہے، جو مچھلی بن کر پانی میں تیرتی ہے، جو چڑیا بن کر ہوا میں اڑتی ہے۔طرح طرح کے جانوروں کی صورت میں زمین پر چلتی پھرتی ہے، انھیں میں وہ جان دار بھی ہے، جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ پراسرار اسباب کے تحت ایک موزوں جسم بنتا ہے، اور اس کے اندر ہڈیاں ایک انتہائی بامعنی ڈھانچے کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ پھر اس کے اوپر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔اس کے اوپر کھال کی تہیں اوڑھائی جاتی ہیں، بال اور ناخن پیدا کیے جاتے ہیں۔ پھر سارے جسم میں خون کی نہریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خودکار عمل کے ذریعے ایک عجیب وغریب انسان بنتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سونگھتا ہے، جو چکھتا ہے، جو سوچتا ہے، جو یاد رکھتا ہے، جو معلومات جمع کر کے ان کو مرتب کرتا ہے، جو لکھتا اور بولتا ہے۔مردہ مادّے سے اس قسم کے ایک حیرت ناک وجود کا بن جانا ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے کہ معجزے کا لفظ بھی اس کے اعجاز (miracle) کو بتانے کے لیے کافی نہیں۔

اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے مٹی کو بولتے ہوئے سنا اور پتھر کو چلتے ہوئے دیکھا تو لوگ حیران ہو کر اس کی تفصیل دریافت کریں گے۔ مگر یہ انسان جو چلتا پھرتا ہے، جو بولتا اور دیکھتا ہے آخر مٹی پتھر ہی تو ہے۔ اس کے اجزاء وہی ہیں، جو ''مٹی اور پتھر'' کے ہوتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کے بولنے اور دیکھنے کی خبر کو ہم جس طرح عجیب سمجھیں گے، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعجب ہم کو اس مخلوق پر ہونا چاہیے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ بے جان مادّے میں اس قسم کی زندگی اور شعور پیدا ہو جانا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہاں ایک برتر ہستی ہے، جس نے اپنی خصوصی قدرت سے یہ عجیب و غریب معجزہ رونما کیا ہے۔

انسان اگر اپنے اوپر غور کرے تو بہ آسانی وہ خدا کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی صورت میں ایک ''میں'' زمین پر موجود ہے۔ اس کی اپنی ایک مستقل ہستی ہے۔ وہ دوسری چیزوں سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ یہ ''میں'' بلا اشتباہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ہے۔ وہ سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ وہ ارادہ کرتا ہے، اور اس کو بالفعل نافذ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ کے تحت کہیں ایک رویہ اور کہیں دوسرا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی شخصیت اور قوت جس کا ایک آدمی اپنی ''میں'' کی سطح پر ہر وقت تجربہ کر رہا ہے یہی ''میں'' اگر خدا کی صورت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ۔ وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ (75:14-15)۔ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے، چاہے وہ کتنی ہی معذرت کرے۔

لوگ خدا پر اور خدا کے پیغام پر یقین کرنے کے لیے معجزاتی دلیل مانگتے ہیں۔ آخر لوگوں کو اس کے سوا اور کون سا معجزہ درکار ہے، جو ناقابلِ قیاس حد تک بڑے پیمانے پر ساری کائنات میں جاری ہے۔ اگر اتنا بڑا معجزہ آدمی کو جھکانے کے لیے کافی نہ ہو تو دوسرا کوئی معجزہ دیکھ کر وہ کیسے ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے اور اس کے آگے اپنے آپ کو سرینڈر کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ہر وقت ہر آدمی کے سامنے موجود ہے۔ اس کے باوجود آدمی اگر خدا کو اور اس کے جلال و کمال کو نہ مانے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، نہ کہ کائنات کا۔

خدا کا وجود

خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ خدا جیسی ہستی کو ماننا جتنا مستبعد ہے، اتنا ہی مستبعد یہ بھی ہے کہ انسان جیسی ہستی کو مانا جائے۔ اگر ہم ایک انسان کو مانتے ہیں تو ایک خدا کو ماننے میں بھی ہمارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی (الحجر،15:29)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی صفات کا ایک بشری نمونہ ہے۔ وجود، زندگی، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری صفاتِ کمال جن کا حقیقی مظہر صرف خدا کی ذات ہے۔ ان کا ایک عکس (نہ کہ حصہ) انسان کو دیا گیا ہے۔ انسان کسی بھی اعتبار سے خدا کا جزء نہیں، مگر وہ اپنی ذات میں اس خدا کی محسوس دلیل ہے، جس خدا کو غیبی طور پر ماننے کا انسان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کے اندر وہ ساری خصوصیات شہود (seen) کے درجے میں موجود ہیں، جن خصوصیات کے ساتھ ایک خدا کو غیب (unseen) کے درجے میں ماننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ دیکھنے اور سننے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، اور منصوبہ بناتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادے کے تحت حرکت کرتا ہے۔ وہ مادہ کو تمدن میں تبدیلی کرتا ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعے خلائی مشین کو چلاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ”میں ہوں“— انھیں صفات کی کامل ہستی کا نام خدا ہے۔

انسان اور خدا میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود غیر حقیقی ہے، اور خدا کا وجود حقیقی۔ یہ مخلوق ہے اور وہ خالق۔ یہ محدود ہے اور وہ لامحدود۔ یہ بے اختیار ہے اور وہ با اختیار۔ یہ فانی ہے اور وہ غیر فانی۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ عطیہ ہے جب کہ خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ذاتی ہے، وہ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔

انسان کو ماننا بلا تشبیہ ”چھوٹے خدا“ کو ماننا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے وہ ”بڑے خدا“ کو نہ مانے۔ ہر شخص جو خدا کو نہیں مانتا، وہ یقیناً اپنا اقرار کرتا ہے۔ وہ انسانی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جو شخص انسان کو مان رہا ہو، اس کے لیے خدا کو نہ ماننے کی کوئی دلیل نہیں۔ انسان کے وجود کا اقرار کرکے وہ خدا کے وجود کا بھی اقرار کر چکا ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا انکار خود اپنا انکار ہے، اور کون ہے جو خود اپنا انکار کر سکے۔

ناقابلِ توجیہہ

انسانی دماغ اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ بے شمار تحقیقات کے باوجود آج بھی ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ایک محقق کے الفاظ میں، دماغ کے بارے میں ہمارا علم جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کتنا کم جانتے ہیں، اور ابھی کتنا زیادہ جاننا باقی ہے:

> The more we know the more we realize how little we know and how much more we need to know.

تحقیقات بتاتی ہیں کہ آئن سٹائن جیسے عبقری انسان جنھوں نے بہ ظاہر اپنی ذہنی صلاحیت کو آخری حد تک استعمال کیا، انھوں نے بھی حقیقۃً اپنے دماغ (brain) کا بہت چھوٹا سا حصہ استعمال کیا۔ ان کے دماغ کا بیشتر حصہ غیر استعمال شدہ رہا، یہاں تک کہ ان کی موت آگئی۔ اس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت نے کیوں اور کیسے ارتقائی عمل کے ذریعے اس معجزاتی چیز کو پیدا کیا جس کو دماغ کہا جاتا ہے:

> Why and how then has nature produced through the evolutionary process this marvellous thing called the human brain.

کہا جاتا ہے کہ ضرورت اور استعمال سے چیزیں ترقی کرتی ہیں۔ مگر جو دماغ سرے سے استعمال ہی نہیں ہوا وہ کیسے وجود میں آیا۔ ڈارونزم کا کہنا ہے کہ جسمانی اعضا اور دماغ پہلے سے پیدا شدہ موجود نہیں تھے۔ وہ حالات کے مقابلے میں زندہ رہنے کی کوشش کے دوران وجود میں آئے ہیں:

> The human organism, including the brain, has developed in response to the challenges it has faced in it effort to survive.

مگر سوال یہ ہے کہ دماغ کے جو حصے سرے سے کبھی استعمال ہی نہیں ہوئے وہ آخر کیسے وجود میں آکر ترقی کرنے لگے۔ جب ''استعمال'' چیزوں کا خالق ہے تو ''عدم استعمال'' نے کس طرح چیزوں

کو پیدا کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر استعمال شدہ دماغ کا ہر انسان کے ساتھ پیدا ہونا اور مسلسل موجود رہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ خارج سے انسان کو دیے جا رہے ہیں نہ کہ انسانی کوشش سے اس کو حاصل ہو رہے ہیں۔ غیر استعمالی دماغ کی موجودگی ڈارون کے اس نظریے کی نفی کر رہی ہے کہ فطرت میں بقائے اصلح (survival of the fittest) اور انتخابی طریقِ عمل (selection process) پایا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

موجودہ زمانے کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان کے دماغ (brain) میں جو پارٹیکل ہیں وہ پوری کائنات کے مجموعی پارٹیکل سے بھی زیادہ ہیں۔ انسانی دماغ کی استعداد بے پناہ ہے مگر کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی اب تک اپنے دماغ کو دس فی صد سے زیادہ استعمال نہ کرسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی ایک امکان ہے۔ مگر موجودہ دنیا اپنی محدودیتوں کے ساتھ اس امکان کے ظہور کے لیے ناکافی ہے۔ انسانی امکان کے ظہور میں آنے کے لیے ایک لامحدود اور وسیع تر دنیا درکار ہے۔ جنت کی دنیا، ایک اعتبار سے، اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہاں آدمی کے امکانات پوری طرح ظہور میں آسکیں۔

یہ محکم نظام

خلا میں بے شمار ستارے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اگر خلا کا ایک کرہ دوسرے کرے سے ٹکرا جائے تو زبردست تباہی برپا ہو۔ ہمارا سولر سسٹم ملکی وے کا حصہ ہے۔ اس میں سورج کے محل وقوع کا زمین پر زندگی کے بقا میں بہت اہم کردار ہے۔ سورج اس علاقے سے دور ہے، جہاں خطرناک سپرنووا کی کثرت پائی جاتی ہے۔ اس دوری کی وجہ سے زمین سپرنووا کے خطرناک اثرات سے محفوظ ہے۔ سورج کہکشاں کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ اگر وہ ملکی وے کے مرکز میں واقع ہوتا تو وہاں پر کثیر تعداد میں موجود اجسام زمین سے ٹکرا سکتے تھے۔ اسی طرح کہکشاں کے مرکز سے آنے والی الکٹرومیگنٹک لہریں کچھ جانداروں کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتی تھیں۔

چاند انتہائی چھوٹا ہے۔ اس کی حقیقت عظیم خلا میں ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔ پھر وہ ہماری زمین سے سب سے قریب ہے۔ اس کے باوجود وہ زمین سے نہیں ٹکراتا۔ جب کہ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارے برابر اپنی عمر ختم کرکے زمین پر گرتے رہتے ہیں۔ چاند کا وزن اندازے کے مطابق، 73.5 ملین میٹرک ٹن ہے۔ اس کا قطر 3500 کیلو میٹر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ 3 لاکھ 84 ہزار کیلو میٹر ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد۔ یہ سلسلہ اربوں سال سے جاری ہے۔ مگر ان کا نظام اتنا محکم ہے کہ وہ نہایت صحت کے ساتھ اپنے مدار (orbit) پر باقی ہے۔ چاند کو زمین کی مقناطیسی قوت (magnatic force) اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر خود چاند کی حرکت کی قوت اس کو مسلسل زمین سے دور ہٹاتی ہے۔ کشش اور حرکت کی ان قوتوں کے باہمی عمل کے نتیجے میں چاند کا راستہ ایک لمبے بیضاوی مدار کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ تمام آسمانی اجسام اسی طرح بیضاوی مدار میں گھومتے رہتے ہیں۔ اگر چاند اپنے مدار کو چھوڑ کر زمین پر گرنے لگے تو اس وقت اس کی رفتار گیارہ کیلو میٹر فی سکنڈ سے زیادہ ہوگی۔ اس تیز رفتاری سے جب وہ ہماری زمین سے ٹکرائے گا تو یہ اس سے بھی زیادہ بڑا حادثہ ہوگا، جو دنیا کے تمام بموں کے یکبارگی پھٹ جانے سے ہوسکتا ہے۔

کائنات کی نشانیاں

''پتھر اور لکڑی کو کوٹ پیس کر ملا دو تو وہ پٹرول بن جائے گا۔'' اس قسم کی بات بہ ظاہر بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً انسان اس طرح کا کوئی واقعہ ظہور میں لانے پر قادر نہیں۔ مگر اسی قسم کے اس سے زیادہ عجیب واقعات اس دنیا میں ہر دن ظہور میں آرہے ہیں۔ قدرت کی کیمسٹری ہر دن ایسے بے شمار واقعات ظہور میں لاتی ہے، جو انسان کے لیے صرف ایک ناقابلِ فہم عجوبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آکسیجن اور ہائڈروجن دو گیسیں ہیں۔ قدرت ان کو ایک خاص تناسب سے ملاتی ہے تو ان کا مجموعہ پانی جیسے سفید سیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کاربن کے ساتھ کچھ نمکیات اور معدنیات جمع ہوتی ہیں تو زندگی وجود میں آجاتی ہے۔ مقناطیسی فیلڈ اور حرکت کو یکجا کیا جاتا ہے تو بجلی جیسی حیرت ناک طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور بجلی کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو انتہائی تیز حرکت وجود میں آجاتی ہے۔ ایک بیج کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے تو اس سے لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کا ایک مجموعہ نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کے بے شمار کرشمے کائنات میں ہر لمحہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ انسان ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نہ خود ان چیزوں میں اپنے آپ کو ظہور میں لانے کی طاقت ہے، اور نہ انسان اس پر قادر ہے کہ وہ بطور خود کسی واقعے کو پیدا کر سکے۔ ''پھر یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔'' اس سوال کے جواب میں کوئی انسان کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خدا کا انش (جزء) ہے۔ یعنی یہ خود خدا ہے، جو اَن گنت صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔

قرآن اس قسم کے جواب کو غیر صحیح قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ چیزیں خدا کا اَنش نہیں، بلکہ خدا کا حکم ہیں۔ یعنی خدا نے اپنی قدرت سے ان کو پیدا کیا ہے، نہ کہ خود خدا ان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

''ستارے'' قدیم زمانے سے شعرا کے حسین تخیلات کا مرکز رہے ہیں۔ ''چاند'' کو انسان دیوتا

کے روپ میں دیکھتا رہا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ستارے ہیبت ناک آگ کے شعلے ہیں، اور چاند اور دوسرے سیارے محض خشک چٹانیں ہیں، جن پر پانی کا ایک قطرہ یا درخت کا ایک پتہ بھی نہیں۔ کائنات انتہائی وسیع ہونے کے باوجود انسان جیسی مخلوق کے لیے انتہائی طور پر غیر موافق ہے۔ ساری معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا سیارہ ہے، جہاں انسان زندہ رہتا ہے، اور تمدن کی تعمیر کرتا ہے۔ بے حد وسیع کائنات میں زمین کا استثنا واضح طور پر ایک ذی شعور ہستی کے وجود کا ثبوت ہے، جس نے بالارادہ زمین پر استثنائی حالات پیدا کیے۔

سائنس داں تقریباً نصف صدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خلا میں زمین سے ملتے جلتے دوسرے سیارے دریافت کریں تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ ہماری زمین کائناتی استثنا نہیں ہے، بلکہ اس طرح کے حالات کم یا زیادہ دوسرے سیاروں پر بھی پائے جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، زمین کا خالق قانونِ ارتقا ہے، نہ کہ کوئی خدا۔ مگر یہ تلاش کھرب ہا کھرب ڈالر خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک ناکامی کے سوا کسی اور مقام تک نہ پہنچ سکی۔

انسان کی بے اختیاری

برٹش سائنس داں سر جیمز جینز نے اپنی کتاب پراسرار کائنات (The Mysterious Universe) میں انسان اور کائنات کے تعلق کے بارے میں لکھا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

It appears that man has strayed in a world which was not made for him.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا، اور نہ وہ اس دنیا کو کنٹرول کرنے والا ہے:

It appears that man has strayed in a world which was not made by him, and nor is he its controller.

اس دنیا میں انسان کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے پاتا ہے۔ لیکن یہ وجود ایک عطیہ ہے، اس نے خود اپنے آپ کو وجود نہیں بخشا۔ انسان کو صحت مند جسم چاہیے۔ صحت مند جسم ہو تو وہ بھرپور زندگی گزارتا ہے، لیکن صحت مند جسم اس کے اپنے بس میں نہیں۔ انسان کو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہ سسٹم ہو تو انسان کامیاب زندگی گزارے گا، لیکن اس سسٹم کو قائم کرنا اس کے اپنے بس میں نہیں۔

انسان کو موافق موسم درکار ہے۔ موافق موسم ہو تو انسان امن و عافیت کے ساتھ زندگی گزارے گا، لیکن موافق موسم کو قائم کرنا انسان کے اختیار میں نہیں۔ انسان اپنی خواہش کے مطابق ابدی زندگی چاہتا ہے، لیکن ہر انسان جو پیدا ہو کر اس دنیا میں آتا ہے، وہ ایک مقرر وقت پر مر جاتا ہے۔ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنے آپ پر موت کو وارد ہونے سے روک دے۔ انسان مکمل طور پر ایک ضرورت مند ہستی ہے، لیکن اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وہ مکمل طور پر ایک خارجی طاقت کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کا یہ پہلو بے حد قابلِ غور ہے۔ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے کامل معنوں میں ایک صاحبِ احتیاج مخلوق ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی کسی ضرورت کو خود پورا کرنے پر قادر نہیں۔ انسان کی زندگی کے یہ دو متضاد پہلو (two contradictory aspects) انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اس معاملے کی حقیقت کو دریافت کرے، اور اس دریافت کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کا نقشہ بنائے۔

انسان کا تجربہ اس کو بتاتا ہے کہ اس دنیا میں وہ صرف ایک پانے والا (taker) ہے، اور دوسری طرف کوئی ہے جو صرف دینے والا (giver) ہے۔ یہ نسبت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے بارے میں سوچے، وہ اپنی زندگی کو حقیقتِ واقعہ کے مطابق بنائے۔ وہ اپنے آپ کو اس مقام پر رکھے جہاں وہ حقیقۃً ہے، اور دوسری ہستی کے لیے اس مقام کا اعتراف کرے جس کا وہ حق دار ہے۔

مختصر الفاظ میں یہ کہ انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ اپنے معاملے پر غور کرے گا تو وہ پائے گا کہ وہ خود اس دنیا میں عبد کے مقام پر ہے، اور دوسری ہستی معبود کے مقام پر۔ یہی دریافت انسان کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ جو انسان اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس حقیقت کو دریافت کرلے، وہی انسان، انسان ہے۔ اس کے لیے تمام ابدی کامیابیاں مقدر ہیں۔ اس کے برعکس، جو شخص اس حقیقت کی دریافت میں ناکام رہے، وہ انسان کی صورت میں ایک حیوان ہے۔ اس کے لیے اس دنیا میں ابدی خسران (eternal loss) کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو شخص اس حقیقت کو دریافت کرلے، وہ فطری طور پر وہ رسپانس (response) دے گا، جس کا ذکر قرآن کی پہلی سورت میں ان الفاظ میں آیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ (1:2)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس برتر ہستی کا شکر جو سارے عالم کا رب ہے، جو انسان کی تمام کمیوں کی تلافی کرنے والا ہے۔ یہ اعتراف انسان کے اندر وہ انقلاب پیدا کرے گا، جب کہ اس کے اندر اپنے رب کے لیے حبِّ شدید اور خشیتِ شدید پیدا ہو جائے۔ یہی وہ فرد ہے، جس کو قرآن میں مومن کہا گیا ہے۔

انسان کے لیے سبق

قرآن میں ایک بات ان الفاظ میں آئی ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ، وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ (75:14-15)۔ یعنی بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز میں ہوئی ہے کہ اگر وہ عذر (excuse) کا شکار نہ ہو، تو وہ خود اپنی تخلیق پر غور کرکے بڑی بڑی باتیں سیکھ سکتا ہے۔ اس کی زندگی خود ایک لائبریری ہے۔ اپنے مطالعے سے خود وہ اپنے لیے بڑے بڑے سبق دریافت کرسکتا ہے۔

مثلاً انسان جب اس کائنات کو دیکھتا ہے، تو اس کو یہ نظر آتا ہے کہ پوری کائنات نہایت منصوبہ بند انداز میں چل رہی ہے۔ مثلاً سورج ہمیشہ ٹھیک اپنے وقت پر نکلتا ہے، اور ٹھیک متعین وقت پر غروب ہوجاتا ہے۔ اسی طرح پوری کائنات زیرو ڈیفکٹ مینجمنٹ کے اصول پر چل رہی ہے۔ اس کے برعکس، انسان کے انتظام میں ہمیشہ نقائص موجود رہتے ہیں۔ انسان اگر اس معاملے کا مطالعہ تقابلی انداز میں کرے، تو وہ خود اپنے مطالعہ کے ذریعے خدائے برتر کے وجود کو دریافت کرلے گا۔ یہ دریافت اس کو یہ کہنے پر مجبور کردے گی: أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (14:10)۔ یعنی کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے۔

اگر آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ قرآن وحدیث کی باتوں کو اپنے الفاظ میں ڈھال سکے تو اس کی دریافت اس کے لیے ری ڈسکوری (rediscovery) بن جاتی ہے۔ وہ مذکورہ باتوں کو زیادہ مؤثر انداز میں دریافت کرنے لگتا ہے۔ مثلاً قرآن میں آیا ہے: وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (14:34)۔ یعنی اس نے تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ اگر آپ کے پاس اپنے مطالعے کے مطابق، یہ لفظ موجود ہو کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جو ہیومن فرینڈلی دنیا ہے۔ اس کا احساسِ شکر بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔

حفاظتی ڈھال

قرآن (21:32) میں فرمایا گیا ہے — اورہم نے آسمان کوایک محفوظ چھت بنایا (وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان (بالائی فضا) کواللہ تعالی نے اپنی رحمت وقدرت سے اس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے ضرررساں چیزوں سے حفاظت کا ذریعہ بن جائے۔ اس نظام خداوندی کے بےشمار پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک جزء غالباً وہ فضائی گیس ہے، جس کواوزون (ozone) کہا جاتا ہے۔

سورج ہماری زمین سے نوکروڑتیس لاکھ میل دور ہے۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ اگراس کے مادے کو تقسیم کیا جائے تو اس سے ہماری زمین جیسے بارہ لاکھ کُرے بن جائیں گے۔ یہ سورج ہمارے لیے روشنی اورحرارت کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں اس کا موجودہ فاصلہ بے حد اہم ہے، اگر زمین سے سورج کا فاصلہ موجودہ فاصلے سے کم ہوتا ہے تو اس سے آنے والی روشنی اورحرارت اتنی شدید ہوتی کہ زمین پرکسی ذی حیات کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہوجائے۔

سورج کی جوشعاعیں (rays) زمین پر آتی ہیں ان میں بعض نہایت مضراجزاء ہوتے ہیں۔ مثلاً ان آفتابی شعاعوں (sun rays) کا ایک جزء وہ ہے، جس کو الٹراوائلٹ شعاعیں (ultraviolet rays) کہا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ذی حیات مخلوق کے لیے سخت مضر ہیں۔ ان سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اوران کی زیادتی انسان اورحیوان کو ہلاک کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

الٹراوائلٹ شعاعیں مسلسل سورج سے نکل کر زمین کی طرف آرہی ہیں۔ اس کے باوجود انسان اورحیوان کیوں زمین پر زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے اوپرکئی سومیل کی جوفضا (atmosphere) ہے۔ اس کی مختلف تہوں میں سے ایک تہ وہ ہے، جواوزون گیس پر مشتمل ہے۔ یہ اوزون ایک قسم کی آکسیجن گیس ہے۔ اس کے مخصوص مالیکولرڈھانچے کی وجہ سے اس میں

یہ صفت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اوپر سے آنے والی الٹراوائلٹ شعاعوں کو جذب کرلے اوران کوزمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق، یہی اوزون گیس کی تہ ہے جو انسان کو الٹراوائلٹ شعاعوں کے مضر اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے زمین کے اوپر بالائی فضا میں ایک محفوظ چھت قائم کی۔ بالائی فضا(atmosphere) کے بارہ میں موجودہ زمانے میں جو سائنسی تحقیقات ہوئی ہیں وہ قرآن کے اس بیان کے حق میں ایک علمی تائید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ فضا کے اوپر اوزون گیس کی ایک موٹی تہہ ہے، جو کرۂ ارض کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فضائی چھتری انسان کے لیے ایک حفاظتی ڈھال کا کام کررہی ہے۔ اس حفاظتی ڈھال کے بغیر انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ زمین کے اوپر آباد ہو اور یہاں تمدن کی تعمیر کرے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بالائی فضا میں 20 کیلومیٹر اور 50 کیلومیٹر کی بلندی کے درمیان موجود گیسوں میں قدرتی طور پر ایک ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بننے والے نئے قسم کے مالیکیول سے ایک گیس تیار ہوتی ہے، جس کو اوزون کہا جاتا ہے۔ یہ اوزون زمین کے چاروں طرف فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ الٹراوائلٹ شعاعوں کو جذب کرلیتی ہے، اوراس طرح وہ زمین کے اوپر زندگی کے لیے ایک اہم حفاظتی ڈھال کا کام کرتی ہے:

> In the region between about 20 and 50 kilometers the. monatomic oxygen reacts with 02 to form ozone (03).The resulting worldwide layer of ozone, although its relative concentration is less than 1/10,000, is sufficient to absorb ultraviolet radiation and thereby serve as a vital protective shield for life on earth. (2/322-23)

موجودہ زمانے میں صنعتی تمدن نے انسان کے لیے نئے مسائل پیدا کیے ہیں۔ ان میں ایک خطرناک مسئلہ یہ ہے کہ جدید صنعتوں کے پیدا کردہ بعض گیسوں کی وجہ سے اوزون کی تہہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ فضا کی اوزون میں رخنہ پڑنے سے، کم از کم جزئی

طور پر، الٹرا وائلٹ شعاعوں کو زمین تک پہنچنے کا راستہ مل جائے اور پھر انسان کے لیے طرح طرح کے ناقابل حل مسائل پیدا ہوجائیں۔

موجودہ زمانے میں اس پر باقاعدہ ریسرچ کی جاری ہے، اوراس سلسلے میں کافی لٹریچر شائع کیا گیا ہے۔ ٹائم میگزین (17 فروری 1992) نے اس مسئلے کو اپنی کور اسٹوری بنایا ہے۔ اس کا عنوان ہے— ختم ہوتی ہوئی اوزون، خطرہ قریب آرہا ہے:

Vanishing Ozone: the Danger Comes Closer.

زندگی کے لیے یہ ضروری گیس جس کی بربادی کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، وہ آکسیجن کی ایک قسم ہے جس کے مالیکول میں تین ایٹم ہوتے ہیں، جب کہ عام آکسیجن کے مالیکیول میں دو ایٹم ہوتے ہیں۔ ڈھانچے میں اس سادہ تبدیلی نے اوزون میں یہ صلاحیت پیدا کردی ہے کہ وہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کو جذب کر سکے:

> The vital gas being destroyed is a from of oxygen in which the molecules have three instead of the normal two. The simple structure enables ozone to obsorb ultraviolet radiation. (p. 41)

سائنسی نقطۂ نظر سے مالیکول کے ایٹمی ڈھانچے میں یہ تبدیلی ہی وہ سبب ہے، جس کی بنا پر اوزون اس صفت کی حامل گیس بن گئی ہے کہ وہ سورج سے آنے والی مضر گیس کو اپنے اندر جذب کرلے اور اس کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بالائی فضا میں اوزون کی یہ گیسی چادر ہم کو مسلسل طور پر الٹرا وائلٹ شعاعوں کے مہلک اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

مگر کوئی عقلی یا سائنسی دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے موجود نہیں کہ ایٹم کی تعداد میں تبدیلی بذاتِ خود اپنے اندر اس قسم کی انوکھی اور مفید صلاحیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس آسمانی آگ سے بچانے والا خدا ہے۔ ظاہری طور پر مذکورہ تبدیلی اس لیے پیدا کی گئی تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ وہ اس ظاہری واقعہ کو دیکھ کر اندرونی حقیقت تک پہنچ سکے۔

ایک طرف فطرت کے نظام میں اوزون گیس کا ہونا، دوسری طرف جدید صنعتی نظام کے تحت اوزون گیس کی تباہی، یہ دونوں واقعات بے حد سبق آموز ہیں، اوران میں سوچنے والوں کے لیے عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

بالائی فضا میں اوزون گیس کی موٹی تہہ کا پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ جس ہستی نے دنیا کا نظام بنایا، اس کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی کیا ضرورتیں ہوں گی۔ اس نے تجربے سے پہلے یہ جانا کہ سورج کی شعاعوں میں افادیت کے ساتھ نقصان کے پہلو بھی موجود ہیں۔ اس نے افادیت کے پہلو کو مستحکم کیا اور نقصان والے پہلو سے بچاؤ کا انتظام کردیا تا کہ انسان جب زمین پر بسے تو وہ سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے محفوظ رہے، سورج کی صرف مفید شعاعیں انسانوں تک پہنچ سکیں۔

اب دوسرے رخ کو دیکھیے، جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ انسان نے ساٹھ سال پہلے وہ چیز دریافت کی جس کو ایر کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے انسان کو غیر معمولی طور پر راحت کا سامان دیا۔ ایر کنڈیشنڈ مکان اور دفاتر اور مختلف بلڈنگیں ماڈرن زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ جب یہ صنعت دریافت ہوئی تو وہ خیر ہی خیر نظر آتی تھی، مگر جدید تحقیقات نے بتایا کہ اس خیر میں شر بھی چھپا ہوا ہے۔

موجودہ ایر کنڈیشننگ کا سسٹم سی ایف سی پر مبنی سسٹم (CFC-based system) ہے۔ سی ایف سی ٹکنالوجی آج انسان کے لیے زبردست خطرہ بن گئی ہے۔ سی ایف سی سے مراد کلوروفلوروکاربن (chlorofluorocarbons) ہے۔ یہ ایک کیمیکل ہے جو ایر کنڈیشننگ کے سامانوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کیمیکل کو تیار کرنے کے لیے جو کارخانے بنائے گئے ہیں، وہ اس کی تیاری کے دوران ایک ضمنی پیداوار (by-product) تیار کرتے ہیں، جس کو سی آئی او یا کلورین مونوآکسائڈ (chlorine monoxide) کہا جاتا ہے۔ یہی سی آئی او کا مادہ ہے، جو دراصل اوزون کی تہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ حتی کہ اس نے بالائی فضا میں ایک بڑا سوراخ پیدا کردیا

ہے، جس سے سورج کی مذکورہ مضر شعاعیں زمین پر آنا شروع ہوگئی ہیں۔

اب امریکا وغیرہ میں بہت بڑے پیمانے پر ریسرچ ہورہی ہے۔ تاکہ کوئی ایسا متبادل مادہ دریافت کیا جائے جس کے ذریعے مذکورہ مضر کیمیکل پیدا کیے بغیر ایر کنڈیشننگ کے سامان بنائے جاسکیں۔

اب یہاں دو نمونے ہیں۔ ایک، فطرت (نیچر) کا نمونہ۔ دوسرا، انسانی صنعت کا نمونہ۔ فطرت کا نمونہ بتاتا ہے کہ اس میں پیشگی طور پر یہ انتظام موجود تھا کہ سورج کی مضر شعاعیں زمین کی سطح تک نہ پہنچیں۔ تاکہ انسان محفوظ طور پر زمین پر آباد ہوسکے۔ دوسری طرف صنعتی دور کے صنعت کاروں کو پیشگی طور پر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی کنڈیشننگ کی صنعت فطرت کے قیمتی توازن کو توڑ دے گی، اور انسان کے لیے سخت ناموافق صورتِ حال پیدا ہوجائے گی۔

یہ صورتِ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کی منصوبہ بندی کے پیچھے ایک بالاتر خدائی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ اگر یہاں ایسے ذہن کی کارفرمائی نہ ہوتی تو فطرت کے نظام میں بھی بار بار اسی قسم کے خلا اور نقائص ظاہر ہوتے جو انسانی صنعت میں ظاہر ہورہے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے۔ تم رحمن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ناکام تھک کر تمھاری طرف واپس آجائے گی (67:1-4)۔

خلاصۂ کلام

اللہ تعالی نے سورج پیدا کیا، سورج کی پیدائش زمین پر انسان کی آبادی سے بہت پہلے ہوئی۔ مگر اللہ تعالی کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ سورج کی شعاعوں کا ایک جزء (الٹراوائلٹ) انسان کے لیے مضر ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے پیشگی طور پر بالائی فضا میں ایک محکم حفاظتی انتظام کر دیا، جو انسان کو

اس مضر شعاع سے بچا تا رہے۔

دوسری طرف انسانی انجینئروں اور سائنس دانوں نے زمین پر ایک انڈسٹری قائم کی۔ اس انڈسٹری سے ایک ایسی گیس نکلنے والی تھی، جو فضا میں بلند ہو کر اس حفاظتی انتظام میں رخنہ پیدا کردے، جو انسان کو سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے بچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ مگر انسانی ماہرین کو اس کا علم صرف اس وقت ہوا، جب کہ ان کی انڈسٹری کے یہ مضر نتائج عملاً ظہور میں آ گئے، اور انسان ان کا شکار ہونے لگا۔

یہ تقابلی مثال بتاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق نہ صرف یہ کہ ذہن کے بغیر نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان جیسی ذہانت بھی اس عملِ تخلیق کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے مافوق ذہانت (سُپَر ذہانت) درکار ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ذہن کے بغیر موجودہ بامعنی کائنات کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

کائنات ایک آئینہ

کائنات ایک آئینہ ہے جس میں اس کے خالق کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز ایک نشانی ہے۔ ہر چیز ایک حقیقت کا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اگر آدمی کے اندر دیکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر چیز میں ایک معنویت دیکھے گا۔ موجودہ دنیا اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ اس کے لیے معرفتِ الٰہی کا عظیم خزانہ بن جائے گی۔

ریاضیاتی دنیا

کائنات بہ ظاہر ایک ریاضیاتی کائنات ہے۔ کائنات ریاضی کے اصولوں کی حد تک منظم ہے۔ یہ موجودہ کائنات کا ایک ایسا پہلو ہے جو اس کے ہر حصے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

شہد کی مکھی حد درجہ صحت کے ساتھ مسدس اشکال (hexagonal) کے چھتے بناتی ہے۔ ایٹم کے ذرات کی کمیت انتہائی یکساں طور پر متعین ہوتی ہے۔ زمین کی دوطرفہ گردش اتنی صحت کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے اور ہزاروں سال آگے تک کے کلنڈر بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی کائنات کے تمام اجزاء کا حال ہے۔ کائنات کا ہر جزء اتنے محکم اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے کہ نہایت صحت کے ساتھ اس کے مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

کائنات کا یہ پہلو سائنس دانوں کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ حتی کہ انھیں یقین ہو گیا ہے کہ پوری کائنات ایک ریاضیاتی ماڈل ہے، کسی چیز کو جب تک وہ ریاضیاتی طور پر نہ سمجھ لیں، وہ گمان کرتے ہیں کہ ابھی انھوں نے اس کو سمجھا نہیں۔

سائنس داں عالم فطرت کی تحقیق کرتے ہیں۔ اگر چہ سائنس کے درجنوں شعبے ہیں، اور مختلف سائنس داں اپنے شعبوں میں الگ الگ تحقیق اور مطالعہ کا کام کرتے ہیں۔ تاہم ان کے کام کا اگر ایک مشترک عنوان دینا ہو تو وہ یہ ہوگا — کائنات میں ریاضیاتی نظام کی تلاش:

Searching for mathematical order in the universe.

تمام سائنس دانوں کا یہ مشترک عقیدہ ہے کہ کائنات میں ریاضیاتی قطعیت کی حد تک نظم اور ترتیب ہے۔ ایک سائنس داں اپنی تحقیق پر اس وقت بالکل مطمئن ہوجاتا ہے، جب کہ وہ اپنی تحقیق کو ریاضیاتی سانچے میں ڈھال لے۔ ریاضیاتی تصدیق سائنس داں کے نزدیک اس کے نظریے کی صداقت کا آخری ثبوت ہے۔

سائنس دانوں کی جماعت کائنات کے مطالعے میں ریاضی کو اسی طرح استعمال کرتی ہے، جس طرح سناروں کی جماعت اصلی اور نقلی سونے کے لیے کسوٹی (touchstone) کو استعمال کرتی ہے۔ سنار کسوٹی (touchstone) کی تصدیق کے بعد سونے کا سونا ہونا مان لیتا ہے۔ اسی طرح سائنس داں ریاضی کی تصدیق کے بعد نظریے کا صحیح نظریہ ہونا تسلیم کرلیتا ہے۔

ریاضیاتی اور کائناتی نظام کے درمیان یہ مطابقت کیوں ہے۔ بعض سائنس دانوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ ان کے ایک طبقے نے اس کا براہِ راست جواب دیئے بغیر اس کو مزید ایک سوال پر ختم کردیا ہے — کیا کائنات ایک ریاضیاتی ذہن کی تخلیق ہے:

Was the universe created by mathematical mind?

کچھ سائنس دانوں نے اس کا مثبت جواب دیا ہے۔ سر جیمز جینز فلکی طبیعیات کا ایک مشہور عالم ہے۔ اس نے 1932 میں کہا کہ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا نقشہ ایک خالص ریاضی داں نے تیار کیا تھا:

In 1932, Sir James Jeans, an astrophysicist: "the universe appears to have been designed by a pure mathematician." (*Encylopaedia Britannica* (1984) V. 15, p. 531)

کائنات اور انسان

موجودہ اندازے کے مطابق کائنات میں کم از کم دس ارب کہکشائیں (galaxies) ہیں۔ ہر کہکشاں میں تقریباً ایک کھرب ستارے ہیں۔ ان میں سے اکثر ستارے ہمارے سورج سے بہت زیادہ گرم اور بہت زیادہ بڑے ہیں جب کہ ہمارا سورج اتنا بڑا ہے کہ اس سے زمین جیسے بارہ لاکھ

کرے بنائے جاسکتے ہیں۔ یہ اَن گنت متحرک ستارے ایک دوسرے سے اتنے زیادہ دوری پر ہیں جیسے بحرالکاہل میں بکھرے ہوئے چند سمندری جہاز۔ اس ناقابلِ قیاس حد تک بڑی دنیا میں زمین کا چھوٹا سا کرہ (planet) ایک انتہائی نادر استثنا ہے، جہاں پانی اور ہوا اور دوسری چیزیں ہیں جو انسان جیسی مخلوق کے لیے زندگی کا سامان بن سکیں — یہ دنیا اپنی ساری عظمتوں اور حکمتوں کے باوجود انسان کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ مگر خود انسان کی زندگی اتنی زیادہ بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ ساری کائنات میں بہ ظاہر اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔

انسان اگر نہ ہو تو یہاں کوئی آنکھ نہ ہوگی جو دنیا کی رنگینیوں کو دیکھے، اور کوئی کان نہ ہوگا جو اس کے نغموں کو سنے، اور کوئی دماغ نہ ہوگا جو اس کی حکمت اور معنویت کو پائے۔ یہ دنیا ایک عظیم ترین آرٹ ہے، مگر انسان کے بغیر وہ ایک ایسا آرٹ ہے، جس کا کوئی جاننے والا نہیں۔ جس کی کوئی داد دینے والا نہیں۔ انسان بہ اعتبار حقیقت انتہائی بامعنی ہے۔ مگر انسان کائنات کے موجودہ نظام میں اپنی معنویت کو نہیں پاتا۔ یہاں انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ موجودہ دنیا اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ موجودہ دنیا اپنی ساری معنویت کے باوجود بے معنی ہے، اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانا جائے۔

توازنِ فطرت

قطب جنوبی (انٹارکٹکا) کے بارے میں روسی جغرافیہ سوسائٹی نے تحقیقات کی ہیں۔ انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ قطب جنوبی کے اوپر جو برف جمی ہوئی ہے، وہ دنیا بھر کے تازہ پانی کا 85 فی صد حصہ ہے۔ اس کی مقدار ڈھائی کرور مکعب میٹر (cubic metre) ہے۔ قطب جنوبی کی برف اس وقت صرف ڈیڑھ کرور مربع میٹر (square meter) کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔

اگر اس برف کو دنیا کے تمام خشک حصے پر پھیلا دیا جائے تو موجودہ خشک زمین پر 50 میٹر برف جم جائے گی، اور اگر یہ برف اچانک پگھل جائے تو دنیا کے سمندروں کی سطح 60 سے 70 میٹر تک بلند ہو جائے گی، اور زمین کا دس فی صد حصہ زیرِ آب ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھر کے

تمام ساحلی شہر پانی کے نیچے ڈوب جائیں گے۔ حتی کہ بہت سے ملک پوری طرح پانی کے نیچے چلے جائیں گے۔ قطب جنوبی کی تمام برف پگھلنے کی صورت میں سمندر کی اوسط حرارت دو ڈگری کم ہوجائے گی۔ اس کی وجہ سے زمین پر موسمی تباہی آجائے گی۔ کیوں کہ سمندر میں ایک ڈگری کے ہزارویں حصے کی کمی بیشی فضا میں پوری ایک ڈگری کی حرارت کا فرق پیدا کرتی ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر جو نظام ہے، وہ کس قدر متوازن نظام ہے۔ یہاں بیک وقت مختلف تقاضوں کے درمیان اس طرح توازن قائم رکھا گیا ہے کہ ہر چیز صرف اپنا فائدہ دے، وہ اپنے نقصان سے انسان کو بچائے رکھے۔

فطرت کا توازن زمین کے ہر معاملے میں نمایاں ہے۔ یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک ذہن کارفرما ہے۔ اگر یہاں ذہن کی کارفرمائی نہ ہوتو موجودہ توازن کسی حال میں برقرار نہیں رہ سکتا۔

زمین کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جس ہستی نے زمین کے موجودہ حالات کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے اس کو معلوم تھا کہ یہاں جاندار چیزیں (انسان، حیوان، نباتات) ہیں۔ چنانچہ یہاں کی ہر چیز جاندار اشیا کی ضرورت کے عین مطابق بنائی گئی ہے۔ اگر یہ واقعہ آدمی کو خدا کا یقین نہ دلائے تو آخر وہ کیا چیز ہوگی جو آدمی کو اس کا یقین دلائے گی۔

نیم کا معجزہ

دوسری انٹرنیشنل نیم کانفرنس دسمبر 1983 میں مغربی جرمنی میں ہوئی۔ آج کل نیم کا درخت نباتاتی علما کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیم مضر کیڑوں کو بھگانے والا ایک قیمتی قدرتی ذریعہ (natural repellent) ہے۔ انسان نے کیمیائی طور پر جتنی کیڑا مار دوائیں بنائی ہیں وہ سب کیڑے پر اثر انداز ہونے کے ساتھ فضا کو بھی خراب کرتی ہیں، اور اس طرح انسان کے لیے مضر بنتی ہیں۔ مگر نیم کے اندر یہ انوکھی صفت ہے کہ وہ کسی فضائی نقصان (environmental damage) کے بغیر انسان کو اور نباتات کو مضر کیڑوں سے بچاتی ہے۔

مذکورہ کانفرنس میں 21 ملکوں کے ایک سو سے زیادہ سائنس داں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے دائرے میں نیم کے تجربات بتائے۔ ہالینڈ سے آنے والے ایک عالم ایل ایم اسچون ہیون (Dr. L.M. Schoonhoven) نے اپنے مقالے میں بتایا کہ نیم کے اندر ایک انوکھا دفاعی نظام (unique defence system) ہے۔ یہ نظام ایک بے حد نادر قسم کا کیڑا کنٹرول (insect control) کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹوگو (Togo) میں یہ تجربہ کیا گیا کہ کھیت کی مٹی میں نیم کی پتی ملادی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نباتاتی کیڑوں (plant parasites) کی تعداد بہت گھٹ گئی، اور ایسے کھیت جن میں یہ عمل کیا گیا تھا، فصل کی پیداوار میں نمایاں اضافہ (spectacular increase) ہوا۔

ہندستان کے نمائندے نے اپنے مقالے میں بتایا کہ نیشنل کیمیکل لیبارٹری (پونا) نے نیم کا ایک کمپاؤنڈ تیار کیا ہے، جس کا نام نیمرچ (Neemrich) ہے۔ مثلاً، آلو اور بعض دوسری فصلوں میں نیمرچ کے تجربے کیے گئے جس کے نتیجے میں ان کی پیداوار میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا۔

موجودہ زمانے میں دنیا کے تمام ملکوں میں کیڑا مار دواؤں (pesticides) کا استعمال عام ہے۔ ان دواؤں کے استعمال سے یقیناً زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر ابھی تک انسان یہ دریافت نہ کرسکا کہ ان دواؤں کے استعمال سے فضا پر جو مضر اثرات ہوتے ہیں، ان سے کس طرح بچا جائے۔ یہ کیڑا مار دوائیں اگر ایک طرف کیڑے کو مارتی ہیں تو اسی کے ساتھ وہ انسان کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں۔

اگر آپ لکڑی اور پتی کو آگ میں ڈالیں تو دونوں جل جائیں گی۔ کیوں کہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح انسان اور کیڑے دونوں زندہ انواع ہیں۔ جو چیز ایک کے لیے نقصان دہ ہے وہی دوسرے کے لیے نقصان کا باعث بھی ہوتی ہے۔

انسان کو مضر بیکٹیریا سے بچانے کے لیے اینٹی بایوٹک دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں بیکٹیریا کی طرح انسان کے جسم کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ مکھی، مچھر، دیمک اور دوسرے کیڑوں کو ختم کرنے کے لیے ڈی ڈی ٹی چھڑکا جاتا ہے۔ اس سے مذکورہ کیڑے بھاگتے ہیں یا مر

جاتے ہیں۔مگر اسی کے ساتھ فضا میں ڈی ڈی ٹی کے اجزاء شامل ہوجاتے ہیں۔ انسان سانس کے ذریعے ان کو اپنے اندر داخل کرلیتا ہے، اور پھر طرح طرح کے امراض کا شکار ہوتا ہے۔ پھل اور زرعی پیداوار میں مضر کیڑے لگتے ہیں، جن سے پیداوار بہت کم ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے کیڑا مار دوائیں بنائی گئی ہیں۔ان دواؤں کے استعمال سے باغوں اور کھیتوں کی پیداوار میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ہے، مگر یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ایک طرف ان کیڑا مار دواؤں سے فضا خراب ہوتی ہے، دوسری طرف خود پیداوار میں مضر کیمیائی مادے شامل ہوجاتے ہیں، اور کھانے کے ساتھ انسان کے اندر داخل ہوکر نقصان کا سبب بنتے ہیں۔

ہندستان میں ہر سال تقریباً چالیس ہزار پونڈ کیمیکل دوائیں زرعی کھیتوں میں چھڑکی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں عوام کی صحت کا معیار برابر گر رہا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ (1983) میں بتایا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں زرعی کیڑوں کو مارنے کے لیے جو کیمیائی دوائیں استعمال ہوتی ہیں، ان کے زہریلے اثرات سے ہر سال تقریباً پچاس ہزار آدمی بیمار پڑتے ہیں، اور ان میں سے تقریباً پانچ ہزار آدمی مرجاتے ہیں۔

انسانی سائنس ابھی اس سائنس تک بھی نہیں پہنچی، جس کا مظاہرہ قدرت کے اس معجزہ کی سطح پر ہورہا ہے، جس کو نیم کا درخت کہتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ یہ فرض کیے ہوئے ہیں کہ اس دنیا کا کوئی خالق ومالک نہیں۔ اس دنیا کو چلانے والا کوئی ذہن نہیں۔

''ڈی ڈی ٹی'' کا ایک پیکٹ ہوتو اس کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ یہ پیکٹ اپنے آپ بن گیا ہے۔ ہر آدمی اس کو ذہن کی تخلیق قرار دے گا۔مگر ڈی ڈی ٹی کی نوعیت کی اس سے زیادہ اعلیٰ پیداوار کو دیکھ کر آدمی یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آ گئی ہے۔ نیم کا درخت بلاشبہ ڈی ڈی ٹی سے بہت زیادہ اعلیٰ پیداوار ہے۔ اس کی بناوٹ میں یقینی طور پر غیر معمولی ذہانت پائی جاتی ہے۔ پھر کیسے عجیب ہیں، وہ لوگ جو ڈی ڈی ٹی کے بارے میں یہ مانتے ہیں کہ وہ ذہانت کی پیداوار ہے۔ مگر یہی بات وہ نیم جیسی چیزوں کے بارے میں نہیں مانتے۔

تخلیق میں ذہانت

شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس کر شہد تیار کرتی ہے۔ مگر شہد کی مکھی کا صرف اتنا ہی کام نہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اور بھی کئی اہم کام انجام دیتی ہے۔ انھیں میں سے ایک کام زرخیزی ہے۔ یعنی نر اور مادہ کے زیرے (pollen grains) کو ایک دوسرے پر پہنچانا تاکہ وہ زرخیز ہوسکیں۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ شہد کی مکھی کے ایک ماہر نے لکھا ہے کہ پھولوں کا رس وہ معاوضہ ہے، جو پودا شہد کی مکھیوں کو زرخیز بنانے کے عمل کے لیے ادا کرتا ہے:

Nectar is the fee paid by the plant for the fertilizing service of the insect (bees).

امریکا کے مشرقی حصے میں پھولوں کے رس (nectar) کا نوے فی صد حصہ بے کار چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس علاقے میں شہد کی مکھیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اور اسی نسبت سے زرخیزی کا عمل بھی نسبتاً کم انجام پاتا ہے۔

معلوم کیا گیا ہے کہ شہد کی مکھی جب کسی باغ یا کیاری میں پھولوں کا رس چوس رہی ہوتو وہ بیک وقت ہر قسم کے درختوں کے پھولوں کا رس نہیں چوستی۔ بلکہ وہ یہ کرتی ہے کہ جس پھول کا رس ایک بار لیا ہے، اسی کا رس بار بار لیتی ہے۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی نسل کے پھولوں کے درمیان اڑ کر ایک کے بعد ایک کا رس لیتی رہتی ہے۔

شہد کی مکھی کا یہ طریقہ زراعت اور باغبانی کے لیے بے حد اہم ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ایک مخصوص پھول کے زیرے کو اسی مخصوص درخت کے پھولوں تک پہنچاتی رہتی ہے۔ پھول چوسنے کے دوران پھول کا زیرہ اس کے جسم سے چپک جاتا ہے۔ جب وہ دوسرے پھول پر جا کر بیٹھتی ہے تو اس کا زیرہ اس پھول پر گر جاتا ہے، اس طرح نر اور مادہ کے درمیان زرخیزی کا عمل انجام پاتا ہے۔ اور ان میں تزویج کا عمل جاری رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو تقریباً ایک لاکھ قسم کے پودے زمین سے بالکل ختم ہوجائیں۔

یہ واضح طور پر تخلیق کے نظام میں ذہانت ہونے کا ثبوت ہے۔ اس قسم کا بامعنی واقعہ لازمی طور پر ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے۔ اگر خالق نہ ہو تو تخلیق کے نظام میں اس قسم کی معنویت ممکن نہیں۔

ذرہ بھی غائب نہیں

ہوابازی کے قانون کے مطابق بارہ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ وزنی ہوائی جہازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بلیک باکس رکھیں۔ بلیک باکس دو چھوٹے چھوٹے خاص قسم کے ٹیپ ریکارڈ ہیں۔جس میں سے ایک کو فلائٹ ریکارڈر اور دوسرے کو وائس ریکارڈر کہا جاتا ہے۔ان میں سے ہر ایک اوسطاً 20 انچ لمبا اور 6 انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کا وزن کم وبیش 25 پاؤنڈ ہوتا ہے۔ یہ دونوں ریکارڈ ہوائی جہاز کی دم میں رکھ دیئے جاتے ہیں تا کہ حادثے کے وقت محفوظ رہ سکیں۔ وہ مخصوص نظام کے تحت پائلٹ کی آواز، جہاز کی رفتار اور دوسری ضروری معلومات ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ٹیپ آٹو میٹک طور پر ہر آدھ گھنٹے میں مٹ جاتا ہے تا کہ جہاز کے آخری لمحات کا حال ان سے معلوم ہو سکے۔

23 جون 1985 کو ایک سخت ہوائی حادثہ ہوا۔ایرانڈیا کا ایک بڑا جہاز (بوئنگ 747) کناڈا سے لندن ہوتا ہوا ہندستان آرہا تھا۔زمینی کنٹرول جہاز کی لمحہ لمحہ رپورٹ لے رہا تھا۔اچانک اس کی کمپیوٹر اسکرین پر جہاز کی تصویر غائب ہوگئی۔ جہاز سے پیغامات آنا بالکل بند ہو گئے۔ جہاز ایک حادثے کا شکار ہو کر اچانک اٹلانٹک سمندر میں گر پڑا تھا۔ جہاز پر 329 مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا، جو حادثے کی تفصیلات دنیا والوں کو بتا سکے۔

اب حادثے کی بابت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف وہ بلیک باکس تھا، جو اٹلانٹک سمندر میں تہ نشیں ہو کر رہ گیا تھا۔ اٹلانٹک سمندر دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اس کا رقبہ چھوٹے چھوٹے ذیلی سمندروں کو ملا کر چار کرور گیارہ لاکھ مربع میل ہے۔ اس ناپیدا کنار سمندر میں بلیک باکس کی حیثیت صرف ایک چھوٹے سے ذرہ کی تھی، جو سمندر کے نیچے دو میل کی گہرائی میں پڑا ہوا تھا۔

بہ ظاہر اس ذرے کو سمندر سے نکالنا ناممکن تھا۔ مگر یہ ناممکن ممکن ہو گیا، اور 10 جولائی 1985 کو وائس ریکارڈر اور 11 جولائی 1985 کو فلائٹ ریکارڈر گہرے سمندر کی تہہ سے نکال لیا گیا۔

یہ غیر معمولی کرشمہ کیسے پیش آیا۔ وہ ریموٹ سے کنٹرول کیے جانے والے مشینی انسان (remote-controlled robot) کے ذریعے پیش آیا۔ بلیک باکس میں ایسی مشینیں ہوتی ہیں، جن کے ذریعہ وہ ریڈیائی سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ یہ سگنل اس سے ہر سکنڈ میں نکلتے ہیں، اور تیس دن تک جاری رہتے ہیں۔ فرانس اور امریکا اور برطانیہ کی جدید سامان سے مسلح کشتیوں نے سگنل کے ذریعے ان کے جائے وقوع کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگالیا۔ اس کے بعد مخصوص کیمرہ کے ذریعے اس کی تصویریں لی گئیں۔ پھر مشینی انسان (robot) سمندر کی تہہ میں بھیجے گئے۔ جو انسان کی مانند بازو اور ہاتھ اور انگلیاں رکھتے ہیں۔ یہ روبوٹ ریڈیائی لہروں سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ انسان سمندر کے اوپر مشینی اسکرین پر سارا منظر دیکھتا ہے، اور ریڈیائی لہروں کے ذریعے روبوٹ کی رہنمائی کرتا ہے، تاکہ وہ متعین مقام پر پہنچ کر بلیک باکس کو اپنے ہاتھوں سے پکڑلی، اور پھر اوپر لا کر انسان کے حوالے کردیں۔

یہ طریقہ تھا جس کو استعمال کرکے اتھاہ سمندر سے ایک چھوٹے سے ذرے کو نکال لیا گیا، اور اس نے جہاز کے حادثے کی ساری کہانی انسان کو بتادی۔

جب میں نے اخبارات میں ان تفصیلات کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے اِس واقعے کی صورت میں اُس عظیم تر واقعہ کا اظہار (demonstration) دیا جارہا ہے، جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے: وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (10:61)۔ یعنی تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔

زمین: اللہ کی عجیب وغریب نعمت

روس نے 1977 اپنا اسپیس اسٹیشن (Salyut 6) میں خلا میں بھیجا تھا۔ پروگرام کے مطابق، 25 فروری 1979 کو دو خلا باز ولادیمیر لیاخوف (Vladimir Afanasyevich Lyakhov [1941-2018]) اور ولیری ریومین (Valery Victorovich Ryumin, [b. 1939]) کو وہاں بھیجا گیا۔ ان کو 175 دن تک خلا میں رہنا تھا۔ آخری ایام میں جب کہ وہ اپنے خلائی سفر کی مدت پوری کرکے اپنے وطن واپس آنے والے تھے، زمینی اسٹیشن سے بات کرنے والے نے ان سے پوچھا: آج کل آپ لوگوں کے احساسات کیا ہیں۔ ایک خلا باز نے خبر رساں ایجنسی اے پی کے مطابق، فوراً کہا کہ ہم آج کل کیا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہاں، وہ یہ ہے کہ ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد وہ وقت آئے جب کہ ہم زمین پر دوبارہ اپنا قدم رکھیں:

> What are we dreaming about. Well, we want very much just to put our feet on the ground again. (The Indian Express, August 16, 1979)

یہ دونوں روسی خلا باز (cosmonauts) تقریباً چھ ماہ تک خلا میں چکر لگانے کے بعد زمین پر واپس آئے۔ تقریباً نصف سال تک بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد وہ دونوں مدہوش اور سراسیمہ سے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی نیند غائب ہوگئی تھی۔ خلا میں خوف ودہشت کی وجہ سے وہ بہت کم سو سکے تھے۔

زمین کو اللہ تعالی نے جس طرح بنایا ہے، اور اس پر ہمارے لیے جو موافق حالات جمع کیے ہیں وہ ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہیں۔ ساری معلوم کائنات میں انسان جیسی مخلوق کے لیے کوئی بھی دوسرا ٹھکانا نہیں۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ آدمی زمین سے محروم کردیا گیا ہو، ٹھیک ویسے ہی جیسے فاقہ گزرنے کے بعد آدمی صحیح طور پر جانتا ہے کہ کھانا آدمی کے لیے کیسی قیمتی چیز ہے۔

سائنس کی گواہی

انٹرنیٹ موجودہ زمانے میں معلومات کا عالمی خزانہ ہے۔ انٹرنیٹ کو الکٹرانک انسائکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اگرآپ انٹرنیٹ پر جائیں اورحسبِ ذیل الفاظ ٹائپ کریں — تھاٹ کنٹرولڈ وھیل چیئر(Thought-Controlled Wheel Chair) تو اسکرین پر معلومات کا ایک صفحہ کھل جائے گا۔ وہ بتائے گا کہ کسی خارجی آلہ کے بغیر دماغ کے ذریعے وھیل چیئر کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا ایک شخص اپنے ہاتھ کو استعمال کیے بغیر محض اپنے دماغ کے ذریعے وھیل چیئر کو اپنی مرضی کے مطابق، جس طرح چاہے چلا سکتا ہے۔ جاپان کی موٹر کمپنی (Toyota Motors) نے یکم جولائی2009 کو لوگوں کے سامنے اِس ٹکنالوجی کا مظاہرہ کیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ کس طرح خدا اپنی مرضی کے تحت پوری کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے۔ تھاٹ کنٹرولڈ وھیل چیئر کا کامیاب مظاہرہ تھاٹ کنٹرولڈ کائنات (thought-controlled universe) کا ایک عملی ثبوت ہے۔

مذکورہ سائنسی دریافت اِس حقیقت کو قابلِ فہم بنا دیتی ہے کہ ایک برتر خدائی ذہن (divine mind) ساری کائنات کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لیے ہوئے ہے۔

Thought-Controlled Wheel Chair

Japan's Toyota Motor said yesterday it had invented a way to allow a person to steer an electric wheelchair through simple thought, using a helmet-like device that measures their brain waves. They said that they have developed a way of steering a wheelchair by just detecting brain waves, without the person having to move a muscle or shout a command. Toyota's system, developed in collaboration with researchers in Japan, is among the fastest in the world in analyzing brain waves, it said in a release on Monday. (*The Times of India,* New Delhi, July 1, 2009)

ایک تجربہ

18-22 اپریل 1986 کو میں نے بھوپال کا سفر کیا۔ یہ سفر تامل ناڈو اکسپریس کے ذریعے ہوا اور واپسی کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز طے ہوا۔ 19 اپریل کی صبح کو سو کر اٹھا، تو ہماری ٹرین مدھیہ پردیش کے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ درخت اور سبزہ کا منظر تھا۔ صبح کا سورج بلند ہو کر پوری طرح فضا کو روشن کر رہا تھا۔ اس قسم کی ایک دنیا کا وجود میں آنا تمام عجائبات میں سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں پانی اور سبزہ ہو، جہاں سورج ایک خاص تناسب سے روشنی اور حرارت پہنچائے، جہاں بے شمار اسباب جمع ہوں، جس نے اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ ایک ٹرین تیار ہو، اور زمین کی سطح پر تیز رفتاری کے ساتھ دوڑے۔

بنانے والے نے اس دنیا کو عجیب ڈھنگ سے بنایا ہے۔ یہاں واقعہ دکھائی دیتا ہے، مگر صاحبِ واقعہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تخلیق (creation) کا منظر ہر طرف پھیلا ہوا ہے، مگر ان کے درمیان خالق (Creator) بظاہر کہیں موجود نہیں۔ اس صورتِ حال نے بہت سے لوگوں کو خدا کا منکر بنا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم خدا کو دیکھتے نہیں، تو ہم کیسے اسے مانیں، مگر خدا کے انکار کے لیے یہ بنیاد کافی نہیں۔

ہم جس ٹرین پر سفر کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی ٹرین ہے۔ وہ 110 کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل دوڑ رہی ہے۔ ہم اس کے اندر بیٹھے ہوئے منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ بہ ظاہر ہم ریل کے ڈرائیور کو نہیں دیکھتے۔ اس کا نام بھی ہم کو نہیں معلوم۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ گاڑی کا ایک ڈرائیور ہے، اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔

ہم کو یہ یقین کیوں ہے۔ منکرِ خدا کہیں گے، اس لیے کہ اگرچہ ہم ڈرائیور کو نہیں دیکھتے، مگر ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں، اور وہاں اس کو دیکھیں۔ لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر ہم اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں، اور گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھیں تو ہم کیا چیز دیکھیں گے۔ ہم صرف ہاتھ پاؤں والے ایک جسم کو دیکھیں گے۔ مگر کیا یہی دکھائی دینے والا جسم ہے جو گاڑی کو چلا رہا ہے۔ یقیناً نہیں۔ انجن کو چلانے والا دراصل ذہن

ہے، نہ کہ ظاہری جسم۔ چنانچہ موت کے بعد ڈرائیور کا جسم پوری طرح موجود رہتا ہے، مگر وہ گاڑی کو چلا نہیں پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی وہی صورت حال ہے — ہم گاڑی کا ایک ڈرائیور مان رہے ہیں، بغیر اس کے کہ ہم نے ڈرائیور کو واقعی طور پر دیکھا ہو۔

موجودہ زمانے کے منکرینِ خدا کہتے ہیں کہ یہ دنیا محض اتفاق سے بن گئی ہے۔ اس کا کوئی موجد اور خالق نہیں۔ مگر موجودہ کائنات جیسی بامعنی کائنات کا محض اتفاق سے ظہور میں آنا ممکن نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کباڑ خانے میں دھماکہ ہونے سے ایک اکسپریس ٹرین برآمد ہوجائے یا اچانک ایک ہوائی جہاز بن کر ہوا میں اڑنے لگے۔

☆☆☆☆☆

میں نے شہد کے بارے میں انگریزی کا ایک مضمون پڑھا۔ اس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تقریباً 550 شہد کی مکھیاں مسلسل مشغول رہ کر بیس لاکھ سے زیادہ پھولوں کا رس چوستی ہیں، تب ایک پاؤنڈ شہد تیار ہوتا ہے:

Some 550 busy bees have to dip their snouts into as many as 2.5 million flowers to make just one pound of honey.

شہد کی مکھی کے اندر بے شمار نشانیاں (signs) ہیں۔ مذکورہ واقعہ ان میں سے صرف ایک ہے۔ آدمی اگر اس پر غور کرے تو وہ خالق کے کمالات کے احساس سے سرشار ہوجائے۔

کائناتی مشین

1965 کی جنگ میں پاکستان کے پاس زیادہ بہتر ہتھیار تھے۔ ہندستان کے وجینیت ٹینک کے مقابلے میں پاکستان کا برطانی پیٹن ٹینک زیادہ اعلیٰ تھا۔ ہندستان کے نیٹ جہازوں کے مقابلے میں پاکستان کے فرانسیسی سیبر جیٹ زیادہ طاقت کے ساتھ مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر بھی ہندستان کو جیت ہوئی، اور پاکستان ہار گیا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے۔ وہ ان کو استعمال کرنے کی مکمل مہارت رکھتا تھا جب کہ پاکستان کے ہتھیار بیرونی ملکوں کے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ پاکستانی سپاہی ان کو مہارت کے ساتھ استعمال نہ کر سکے اور ہار گئے۔ ایک جنگی تبصرہ نگار نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

Even the most sophisticated technology of warfare is handled ultimately by men engaged in the profession of soldiering. Its use in combat depends therefore greatly on their skill, training, morale and ingenuity. The doctrine of the supremacy of the man behind the gun thus remains valid even in this age of push-button wars.

جنگ کی انتہائی پیچیدہ مشینری بھی آخر کار متعلقہ فوجی آدمیوں ہی کے ذریعے چلائی جاتی ہے۔ اس لیے جنگ میں ان کا استعمال بہت بڑی حد تک ان کی مہارت، تربیت، جرأت اور تدبیر پر منحصر ہوتا ہے۔ قدیم اصول کے مطابق بندوق کا استعمال کرنے والے آدمی کی اہمیت آج بھی بدستور باقی ہے، حتی کہ اس بٹن دبانے والے دور میں بھی (ٹائمس آف انڈیا، 2 فروری 1984ء)۔

مذکورہ قسم کے واقعات کائنات کی مشینی تعبیر کی تردید ہیں۔ ہماری مشینوں کو چلانے کے لیے ہمیشہ ایک ''انسان'' درکار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی عظیم مشین کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے۔ اس قیاس کے لیے کوئی نظیر موجود نہیں۔ کائنات ایک سائنس دان کے الفاظ میں بالفرض ایک ''گریٹ مشین'' ہو، تب بھی اس کو چلانے کے لیے ایک ''گریٹ مائنڈ'' چاہیے۔ انسان مجبور ہے کہ خدا کو مانے، خواہ مذہبی زبان میں خالق و مالک کی حیثیت سے یا سائنسی الفاظ میں مشین کو چلانے والے انجینئر کی حیثیت سے۔

مشینی ذہانت

کمپیوٹر (computer) ایک ایسی الیکٹرانک مشین ہے، جس کا کام انفارمیشن اورڈیٹا کو ان پٹ ڈیوائسز سے حاصل کرنا، اور ہماری دی ہوئی ہدایات کے مطابق، اس کا تجزیہ کرنا، اور پروسیس کرکے آوٹ پٹ کے ذریعے رزلٹ ظاہر کرنا ہے۔

اس کو انتہائی طویل اور پیچیدہ حسابات کے حل کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہزاروں ریاضی داں مل کر جس حساب کو کئی دن میں حل کریں گے، اس کو ایک کمپیوٹر حددرجہ صحت کے ساتھ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصے میں حل کردیتا ہے۔ کمپیوٹر کے یہ کارنامے دیکھ کر بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ اب سائنس اپنی ترقی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ وہ ''مشینی دماغ'' کو تیار کرسکے۔

اس کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ ایک چیز جو ابھی تک صرف قدرت کے کارخانے میں بنتی تھی، وہ انسانی کارخانوں میں تیار ہونے لگے گی۔ اس کا ایک فلسفیانہ پہلو بھی تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ کائنات کے نظام کے لیے کسی شعوری وجود کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ ایک مشینی دماغ جس طرح نہایت صحت کے ساتھ مختلف واقعات کو رونما کرسکتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا مشینی کارخانہ بھی، اپنے مشینی نظام کے تحت خودبخود چلا جارہا ہے، اس سے ماورا کوئی شعوری ہستی نہیں، جو اس کو چلانے والی ہو۔ تاہم گہرے مطالعے اور تجربے نے اس خوش فہمی کو بے بنیاد ثابت کردیا ہے۔ ایک ماہر نے لکھا ہے:

> The question of artificial intelligence remains mainly unresolved. It is easy for instance, to design a computer which will learn as it goes along and thus come closer and closer to the brain. Nevertheless the lead must come from biological, and not mechanical, intelligence. Thus all these instruments radio-telescope, accelerators, Spectrometers, computers are merely adjuncts to the human brain.

مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) کا مسئلہ بنیادی طور پر ابھی تک غیر حل شدہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ آسان ہے کہ ایک ایسا کمپیوٹر بنایا جائے جو قریب وہی کچھ کرنا سیکھ لے جو انسان کا دماغ کرتا ہے۔ تاہم اس کمپیوٹر کو بنیادی رہنمائی دینا پھر بھی حیاتیاتی ذہانت کا کام رہے گا، نہ کہ کسی مشینی ذہانت کا۔ اس طرح کمپیوٹر کی قسم کے تمام اوزار محض انسانی دماغ کے لاحقے ہیں (ٹائمس آف انڈیا 27 فروری 1980)

مشینی ذہانت (machine intelligence) کے بارے میں اس تجربے نے ان لوگوں کو سخت مایوس کیا ہے، جو یہ امید قائم کیے ہوئے تھے کہ انسان کو بھی اسی طرح ایک خودکار قسم کا مشینی حیوان ثابت کیا جاسکتا ہے، اور پھر خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر مشینی انسان کا اپنی کارکردگی کے لیے زندہ انسان کا محتاج ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کی ہستی کی توجیہہ ایک بالاتر ہستی کو مانے بغیر ممکن نہیں۔ زندہ انسان کے بغیر مشینی انسان کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح خدا کو تسلیم کیے بغیر انسان کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مشینی ارتقا اپنے آپ تخلیقی ارتقا کی تردید کررہا ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک سائنس داں، پروفیسر کارل ٹرال (1975-1899) نے کہا— میری زندگی کا حاصل بحیثیت سائنٹسٹ اور جغرافیہ داں یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ خالق کا شکر گذار ہوگیا ہوں:

"The fruit of my life as scientist and geographer is to have become more and more deeply grateful to our Creator."

Prof. Carl Troll was president of the International Geographical Union from 1960 to 1964

سائنس داں جب قدرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے اندر قدرت کی عظمت کا بے پناہ احساس ابھرتا ہے۔ اس کا اندرونی وجود اُس ہستی کے آگے جھک جاتا ہے، جس نے اتنی بامعنی کائنات بنائی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں خدا کے انکار کا ذہن سائنس دانوں نے نہیں بنایا۔ یہ دراصل کچھ منکر خدا فلاسفہ تھے، جنھوں نے سائنسی دریافتوں کو غلط رخ دے کر اس سے خود ساختہ طور پر انکارِ خدا کا مطلب پیدا کیا۔ حالاں کہ یہ سائنسی دریافتیں زیادہ درست طور پر اقرارِ خدا کی طرف اشارہ کررہی تھیں۔

مشینی تعبیر

جولائی 1983 میں امریکی بحریہ نے فوجی مشقیں کی تھیں۔ یہ فوجی مشقیں سان فرانسسکو کے ساحل پر ہوئیں۔ یہ پورا عمل کمپیوٹروں کے ذریعے ہورہا تھا۔ اس دوران میں بحریہ کے توپ خانہ کو فائر کرنا تھا۔ فائرنگ کے دوران کمپیوٹر میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپیوٹر مخالف جانب گولے برسانے لگا۔ یعنی جس طرف فائرنگ مطلوب تھی اس کے بالکل الٹی طرف۔

ابتدائی پروگرام کے مطابق اس مشقی گولہ باری میں امریکی بحریہ کے توپ خانے کے گولے دور سمندر میں جا کر گرتے مگر توپوں کا رخ الٹا ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گولے ایک مال بردار جہاز کے پاس جا کر گرنے لگے۔ کمپیوٹر میں اس طرح کی غلطیاں پیش آتی رہتی ہے۔ کمپیوٹر کے عمل میں ایسی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کمپیوٹر صرف ایک مادی مشین ہے۔ اس کے پاس عقل نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کائنات اگر ایک مادی مشین ہوتی جیسا کہ جدید ملحدین کا دعوی ہے۔ تو وہ کبھی اس طرح انتہائی درست طور پر نہ چل سکتی جیسا کہ وہ چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین اور اس کی آبادیاں اسی طرح برباد ہوچکی ہوتیں جس طرح زلزلے کے بعد زلزلہ کا مقام برباد ہوجاتا ہے۔ کائناتی حادثات کے نتیجے میں کائنات بھی تباہ ہوچکی ہوتی اور وہ انسان بھی جو کائنات کی مادی تعبیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

’’کائنات کا کوئی خدا نہیں، وہ صرف ایک مادی مشین ہے‘‘ یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے بظاہر درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ درست نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر داخلی تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ جملہ اس وقت صحیح ہوتا ہے، جب کہ ایسی کوئی مادی مشین ہوتی، جو کسی بنانے والے کے بغیر بن جائے، اور کسی چلانے والے کے بغیر چلنے لگے۔ ہم جن مشینوں سے واقف ہیں، ان کو ’’انسان‘ بناتا اور چلاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ یہ مشینیں نقص سے خالی نہیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ کائنات جیسا بے عیب کارخانہ اپنے آپ وجود میں آجائے، اور اپنے آپ نہایت درست طور پر مسلسل چلتا رہے۔

بے خطا نظام

3 جون 1988 کو ہونے والے واقعات میں سب سے اہم اخباری واقعہ وہ حادثہ تھا جو ایران کی ہوائی کمپنی کے ساتھ پیش آیا۔ ایران ایر (Iran Air) کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے اڑا۔ وہ دبئی جانے کے لیے خلیج فارس کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ امریکا کے جنگی جہاز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرا دیا۔ عملہ سمیت اس کے 290 مسافر ہلاک ہو گئے، جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔

یہ بلا شبہ ایک وحشیانہ واقعہ تھا۔ اتنا سنگین وحشیانہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب امریکی بحریہ کے افسروں نے یہ دیا ہے کہ یہ کمپیوٹر کی غلطی (computer error) تھی۔ ان کے کمپیوٹر نے مسافر بردار جہاز کو جنگی جہاز بتایا، اس لیے انھوں نے اس پر وار کیا۔

امریکی بحریہ کے مذکورہ جہاز پر جدید ترین قسم کے راڈار لگے ہوئے ہیں۔ اس راڈار کے ساتھ کمپیوٹر کا انتہائی جدید نظام نصب کیا گیا ہے جو مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) سے مسلح ہے۔ یہ سسٹم یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ فضا میں اڑنے والے جہاز کا معائنہ کرکے راڈار اسکرین پر لفظوں میں لکھ دے کہ وہ کس قسم کا جہاز ہے، دوست یا دشمن۔

3 جون کو جب مذکورہ جہاز فضا کی بلندی میں اڑ رہا تھا تو کمپیوٹر نے اس کا معائنہ کرکے راڈار اسکرین پر جہاز کا اصل نام (ایربس اے 300) لکھنے کے بجائے جٹ فائٹر (F-14 jet fighter) لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوست جہاز نہیں ہے، بلکہ دشمن کا جنگی جہاز ہے۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے افسر (Captain Will Rogers III) نے بٹن دبایا، اور دو میزائل نے اڑ کر جہاز کو اس کے تمام مسافروں سمیت قبرستان میں پہنچا دیا (ہندستان ٹائمس، 13 جولائی 1988، صفحہ 12)۔

جدید ملحدین کا یہ کہنا ہے کہ کائنات ایک مشین ہے۔ اگر کائنات صرف ایک مشین ہے تو یہاں مذکورہ قسم کی مشینی غلطیاں کیوں نہیں ہوتیں۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی کائنات بالکل بے خطا انداز میں مسلسل چلی جا رہی ہے۔

ریموٹ کنٹرول

موجودہ زمانے نے انسانی ڈکشنری میں جن نئے الفاظ کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے ایک ریموٹ کنٹرول(remote control) ہے۔یعنی دور سے کسی ظاہری واسطے کے بغیر کنٹرول کرنا:

Remote control is a system of controlling a machine or a vehicle from a distance by using radio or electronic signals.

موجودہ زمانے میں بہت سی ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، جن میں سگنل یا پیغام تاروں پر نہیں بھیجا جاسکتا۔مثلاً حرکت کرنے والی سواریاں جیسے ہوائی جہاز یا خلائی جہاز، وغیرہ۔ ان حالات میں مشین کو حسبِ منشا چلانے کے لیے ریموٹ کنٹرول یا ریڈیو کنٹرول کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کوڈ کی صورت میں سگنل بھیجے جاتے ہیں۔متعلقہ مشین میں ایک رسیور ہوتا ہے جو مطلوبہ فریکوئنسی پر اس کو وصول کرنے کے لیے ہر آن متحرک رہتا ہے۔موجودہ زمانے میں یہ طریقہ بہت سے کاموں میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔

ریموٹ کنٹرول کا طریقہ اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ خلا میں اپنے مدار پر گھومنے والی مشینوں کو زمین سے نہایت صحت کے ساتھ ہدایات بھیجی جاتی ہیں، اور ان کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اگر ان کے اندر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو کسی مادی واسطے کے بغیر محض ریڈیائی لہروں کے ذریعے ان کو زمین ہی سے درست کر دیا جاتا ہے۔حتی کہ اس ایجاد نے تخریب کاروں کو بھی جدید مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ چنانچہ 25 مئی 1985 کو امیر کویت کی موٹر کار کے پاس جو بم پھٹا، وہ ریموٹ سے کنٹرول کیا جانے والا ایک بم(remote-controlled bomb) تھا۔

ریموٹ کنٹرول کا یہ نظام ایک معنوی حقیقت کا مادی مظاہرہ ہے۔ یہ ایک عملی مثال کی صورت میں بتا رہا ہے کہ خدا کس طرح پھیلی ہوئی کائنات کو بلاواسطہ کنٹرول کرتا ہے، اور کس طرح اس کو اپنی منشا کے مطابق چلا رہا ہے۔ریموٹ کنٹرول ریڈیو اگرچہ ایک انسانی واقعہ ہے۔مگر اس نے عظیم تر خدائی واقعے کو ہمارے لیے قابلِ فہم بنا دیا ہے۔

خدا انسانی فطرت کی آواز

خدا کا عقیدہ

ایک تحقیقاتی مطالعے میں بتایا گیا ہے کہ ہم پیدائشی طور پر خدا میں عقیدہ رکھنے والی مخلوق ہیں (we are born believers)۔ انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک برتر ہستی کا تصور اس کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ یہ تصور اتنا قوی ہے کہ کوئی بھی تربیت اس کو ختم نہیں کرسکتی۔ اس حقیقت کو نفسیات کے ایک عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

Belief in God is hardwired in our brain

یہ تحقیق ٹائمس آن لائن میں چھپی ہے، جس کو نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا، نے اپنے شمارہ 8 ستمبر 2009 نے نقل کیا ہے۔ مگر ماہرین کی رپورٹ میں غلط طور پر انسان کی اس خصوصیت کو نظریۂ ارتقا سے وابستہ کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ انسانی ذہن کی خدا پر عقیدے کی پروگرامنگ بذریعہ ارتقا ہوئی ہے، تاکہ اپنے اس عقیدے کی بنا پر انسان جہد للبقا کے عمل میں زیادہ بہتر مواقع پاسکے:

Human beings are programmed by evolution to believe in God, because it gives them a better chance of survival.

یہ سرتاسر ایک غیر منطقی بات ہے۔ تحقیق سے جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر فوق الطبیعی عقیدہ (supernatural belief) موجود ہوتا ہے۔ کوئی مرد یا عورت اس سے خالی نہیں۔ مگر یہ بات سرتاسر غیر ثابت شدہ ہے کہ یہ عقیدہ کسی مفروضہ ارتقا (evolution) کے ذریعے انسان کے اندر خود بخود پیدا ہوا ہے۔

موجودہ زمانے میں مختلف شعبوں میں علمی تحقیقات کی گئی ہیں۔ ہر شعبے کے تحقیقاتی نتائج اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر ایک برتر ہستی کا عقیدہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ذہن ہر انسان کو کسی نہ کسی پہلو سے مذہبی بنا دیتا ہے۔ حتی کہ جو لوگ بظاہر ملحد (atheist) سمجھے جاتے ہیں، ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں بھی یہ تصور موجود ہوتا ہے۔

فطرت کی آواز

خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ عام حالات میں یہ آواز چھپی رہتی ہے۔ مگر جب زندگی میں کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو یہ آواز جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس فطرت سے خالی نہیں۔ اس قسم کی چند مثالیں ذیل میں دی جا رہی ہیں:

جینا لولو برائیگیڈا (Gina Lollobrigida, [b. 1927]) ایک اٹالین فلم ایکٹرس ہے۔ جنوری 1975ء میں وہ ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

> To a question whether she believed in God, Gina said: I believe in God, I believe in God, more when I am on an aeroplane. *(The Times of India,* 3 January 1975)

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، جینا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمھیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے، اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے (31:31-32)۔

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار

خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

روس میں اشترا کی انقلاب اکتوبر 1917ء میں آیا، اور تقریباً 74 سالوں کے بعد 1991 میں وہ ٹوٹ گیا۔ اس درمیان اشترا کی حکومت نے میڈیا، اور اسکول کو اینٹی مذہب پروپیگنڈے سے فلڈ (flood) کر دیا۔ اشترا کی نظریے کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ (appendix) تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمے کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ روسی حکومت کا دعوی ہے کہ اس نے مذہب کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتی کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔ ذیل میں اس سلسلے کے چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں:

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (1879-1964ء) کا ہے۔ اسٹالن خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (1874-1965) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست 1942ء میں ماسکو کا سفر کیا تا کہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لیے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلے میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا، جس کا خفیہ نام ٹارچ (Torch) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبے میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبے کی تشریح کے ایک خاص مرحلے پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں۔ اس کی زبان سے نکلا — خدا اس منصوبے کو کامیاب کرے:

"May God prosper this undertaking"

(Winston S. Churchill, *The Second World War,* (Abridgement) Cassell & Company, London, 1965, p. 603)

سویتلانا (Svetlana Alliluyeva) روسی ڈکٹیٹر اسٹالن کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش 1926 کو ہوئی، اشترا کی دنیا سے مایوس ہو کر 1966 میں وہ ہندستان آئی تھی۔ پھر وہ یورپ چلی گئی،

اور 2011 میں اس کی وفات ہوئی۔

اس نے عیسائیت کو اختیار کرلیا تھا۔ اپنے سچائی کے تلاش کا واقعہ لکھتے ہوئے وہ اپنی کتاب ''صرف ایک سال'' (Only One Year) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو میں غیر مطمئن تھی، اور اپنے قلب کی تسکین کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ چیز مجھے بائبل کے ان جملوں میں مل گئی — اے خداوند! تو میری روشنی اور نجات دہندہ ہے۔ مجھے تو کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔ خداوند میری زندگی کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ پس میں کسی بھی شخص سے خوف نہیں کھاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ شریر لوگ مجھ پر چڑھائی کریں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کریں گے، اور مجھے نیست و نابود کردیں گے، لیکن وہ ٹھوکر کھائیں گے اور گریں گے۔ اگر چاہے پورا لشکر بھی مجھ کو گھیر لے، میں نہیں ڈروں گا، اگر جنگ میں بھی لوگ مجھ پر حملہ کریں میں نہیں ڈروں گا:

The Lord is my light and my salvation, whom shall I fear? The Lord is the stronghold of my life — of whom shall I be afraid? When the wicked advance against me, to devour me, it is my enemies and my foes, who will stumble and fall. Though an army besiege me, my heart will not fear; though war break out against me, even then I will be confident. (Psalm, 27:1-3)

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ وہ ہے، جو 1973 میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (Ilyushin Jet) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا میں پرواز کررہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہوگیا۔ ہواباز کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں، اور جہاز زمین پر گر پڑا۔ ہواباز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہوگئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا، اس لیے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے، جس کو عام طور پر بلیک باکس (Black Box) کہتے ہیں۔ یہ بلیک باکس ہواباز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں رکھا جاتا ہے تاکہ

ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبے سے اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی پائلٹ کی زبان سے جو لفظ نکلا، وہ یہ تھا — پیٹر ہم کو بچا (Peter save us)۔

واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے، اور عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

کمیونسٹ حکومت کے آخری زمانے میں 1990 میں راقم الحروف نے سوویت یونین (روس) کا سفر کیا تھا۔ اُس وقت میخائل گورباچیف (Mikhail Gorbachev) وہاں کے صدر تھے۔ اُس زمانے میں وہاں آزادی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے چرچ اور مسجدیں جو پہلے ویران رہا کرتی تھیں، اب وہاں مذہبی سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اپنے گائڈ سے کہا کہ ہم نے پہلے سنا تھا کہ روس میں مذہب مر چکا ہے، مگر یہاں تو وہ زندہ حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ گائڈ نے جواب دیا کہ مذہب یہاں ہمیشہ زندہ تھا۔ جو فرق ہوا ہے، وہ صرف یہ کہ پہلے یہاں مذہب اَنڈر گراؤنڈ (underground) تھا، اور اب وہ سامنے آ گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور انسان کی فطرت میں آخری حد تک پیوست ہے۔ کوئی شخص اگر اپنی زبان سے خدا کا انکار کرے، تب بھی خدا کا شعور اس کے دل کے اندر پوری طرح موجود رہتا ہے۔ سوویت یونین کے سابق صدر میخائل گورباچیف پہلے ایک ملحد کمیونسٹ تھے، مگر اب ان کی دبی ہوئی فطرت جاگ اٹھی ہے۔ انھوں نے خود اِس کا اعتراف کیا ہے۔ برٹش نیوز پیپر ڈیلی ٹیلی گراف (The Daily Telegraph) کی ایک رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (20 مارچ 2008) میں چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ گورباچیف اٹلی کے ایک چرچ میں پہنچے، اور وہاں انھوں نے اپنے عقیدے کے مطابق، خدا کی عبادت کی:

Gorbachev, who had earlier publicly pronounced himself as an

atheist, acknowledged his Christian faith while paying a surprise visit to pray at the tomb of St Francis of Assisi in Italy (p. 22).

خدا کا شعور انسان کی فطرت میں اِس طرح شامل ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اُس سے جدا نہیں ہوتا۔ اِس معاملے میں منکرین اور ملحدین کا بھی کوئی استثنا نہیں۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد کے روس میں اس قسم کے شواہد کثرت سے ملے ہیں۔

مسٹر رچرڈ نکسن (1913-1994) امریکا کے 37 ویں صدر تھے۔ وہ 1969 میں امریکا کے صدر منتخب ہوئے اور 1974 میں ان کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ صدارت سے اُن کی رخصت کا سبب واٹر گیٹ اسکینڈل بنا۔ ان کے زمانۂ صدارت کے آخری دنوں پر ایک کتاب لکھی گئی ہے— آخری ایام:

The Final Days, by Bob Woodward and Carl Bernstein, Simon and Schuster, 1976, 476 pages

کتاب کے مطابق، اسکینڈل کے انکشاف سے صدر نکسن بہت پریشان ہوگئے تھے۔ جب صدارت کا خاتمہ قریب آ گیا تو نکسن نے اپنے سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر (پیدائش 1923) سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں، اور دونوں مل کر دعا کریں۔ ''نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو، نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں۔'' نکسن نے کہا اور عیسائی طریقِ عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے:

As the end neared, Nixon asked secretary of state Henry Kissinger to kneel and pray with him, saying: "You are not a very orthodox Jew and I am not an Orthodox Quacker, but we need to pray." (Daily American [Rome] March 27, 1976)

برٹرینڈ رسل (1872-1970) ایک انگریز مفکر ہے۔ وہ موجودہ زمانے کا بہت بڑا ملحد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ انسان بہ ظاہر خواہ کتنا ہی بڑا ملحد ہو جائے وہ اپنے آپ کو خدائی فطرت سے آزاد نہیں کر سکتا۔ برٹرینڈ رسل 1952 میں یونان گیا۔ اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ یہ یونان کا میرا پہلا سفر تھا، اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے لیے

بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ ایک پہلو سے تو مجھے خود تعجب ہوا۔ وہ عظیم اور ٹھوس کامیابیاں جن کو دیکھ کر ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ میں بھی متاثر ہوا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے چرچ میں پایا۔ یہ اس وقت کی یادگار تھا جب کہ یونان بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس سے میں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ مانوس پایا جتنا کہ میں یونان کی قبل مسیح دور کی یادگاروں سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ مسیحی نقطۂ نظر میرے اوپر اس سے زیادہ غالب ہے، جتنا کہ میں نے سمجھا تھا۔ یہ غلبہ میرے عقائد پر نہیں تھا بلکہ میرے احساسات پر تھا:

> To my astonishiment, I felt more at home in this little church than I did in the Parthenon or in any of the other Greek buildings of Pagan times. I realised then that the Christian outlook had a firmer hold upon me than I had imagined. The hold was not upon my belief, but upon my feelings. (p. 561)

یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جس کی ملحدانہ کتابوں میں سے ایک کتاب وہ ہے، جس کا نام ہے: میں عیسائی کیوں نہیں (*Why I Am Not A Christian?*)۔ حقیقت یہ ہے کہ برٹرینڈ رسل کے یہ الفاظ اس کی فطرت کی پکار ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں خدا اور مذہب کا شعور ابدی طور پر پیوست ہے، وہ چاہے بھی تو اس کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحد اور منکر بھی اندر سے اپنے الحاد وانکار پر غیر مطمئن رہتے ہیں، وہ خاص لمحات میں بے تابانہ طور پر اسی چیز کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جس کا بہ ظاہر وہ اپنی زبان سے انکار کر رہے تھے۔

خدا کی نشانیاں

میکسویل (James Clerk Maxwell [1831-1879]) وہ شخص ہے، جس نے فطرت میں برقی مقناطیسی تعامل کے قوانین کو انتہائی کامیابی کے ساتھ ریاضیاتی مساوات میں بیان کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عظیم جرمن سائنسداں بولٹز مین نے اس کو دیکھا تو اس نے تعجب کے ساتھ کہا کہ کون وہ خدا ہے جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں:

> Maxwell put the laws of electromagnetic interactions into equations so marvellous that when the great German physicist, Boltzmann, saw them he exclaimed, 'Who was the God who wrote these signs?'

کائنات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہر مطالعہ بالآخر ایک ایسی چیز پر ختم ہوتا ہے جو انتہائی پراسرار طور پر حکیمانہ ہوتی ہے۔ کائنات اپنے آخری مطالعے میں ایک حد درجہ منظم واقعہ ہے، نہ کہ کوئی بے ترتیب انبار۔ یہ حقیقت ہر واقف کار کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ کائناتی واقعات کے پیچھے کوئی برتر ذہن کام کر رہا ہے۔

آئن اسٹائن ایک خالص سائنسی مزاج کا آدمی تھا۔ تاہم اس نے اقرار کیا ہے کہ میں طبیعیات داں سے زیادہ ایک فلسفی ہوں۔ کیوں کہ میرا یقین ہے کہ ہمارے باہر بھی ایک حقیقت ہے:

> I am more a philosopher than a physicist, for I believe there is a reality outside of us. — The World as I See It.

آئن اسٹائن اپنے اس ذہن کی وجہ سے کہتا ہے کہ اس معنی میں میں بھی ایک پکا مذہبی آدمی ہوں:

> In this sense, I belong to the ranks of devoutly religious men.

کائنات خدا کی نشانی ہے۔ وہ مخلوق کے روپ میں خالق کی تصویر دکھاتی ہے۔ جو شخص کھلے ذہن کے ساتھ کائنات کو دیکھے گا، وہ اس کے اندر اس کے خدا کو پالے گا۔ البتہ جن کے ذہن میں ٹیڑھ ہو، وہ روشنی کے درمیان بھی اندھیرے میں رہیں گے، وہ خدا کے قریب کھڑے ہو کر بھی خدا کو نہ پائیں گے۔

حقیقت کی تلاش

گلیلیو گلیلی (1642-1564) اپنی سادہ دوربین سے چاند کا صرف سامنے کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ آج کا انسان خلائی جہاز میں لگے ہوئے دوربینی کیمروں کی مدد سے چاند کا پچھلا رخ بھی پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کل اور آج میں علمی اعتبار سے کتنا زیادہ فرق ہو چکا ہے۔

مگر ان جدید معلومات تک پہنچنے کی قیمت بہت مہنگی ہے۔ 10 اکتوبر 1980 کو نیو میکسیکو میں دنیا کی سب سے بڑی دوربین نصب کی گئی۔ اس کی قیمت 78 ملین ڈالر تھی۔ امریکا کا ایک خلائی جہاز، وائیجر 1 (Voyager 1) جو نومبر 1980 میں زحل کے پاس پہنچا اس کی لاگت 340 ملین ڈالر تھی۔ یورپ میں پارٹیکل فزکس کی بین اقوامی لیبوریٹری (CERN) 1981 میں مکمل ہوئی ہے، اس کا مقصد اینٹی میٹر کو توڑ کر میٹر میں تبدیل کرنا ہے، اس لیبوریٹری کی لاگت 120 ملین ڈالر ہے۔ یہ ادارہ ایک اور زیادہ بڑی تحقیقی مشین تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے، جس کی لاگت 550 ملین ڈالر ہوگی۔ پروٹان کی تحقیق کے لیے امریکا میں ایک مشین بنائی گئی ہے، جس کی لاگت 275 ملین ڈالر ہے، وغیرہ۔

ذراتی طبیعیات (particle physics) میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی دل چسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ 1927 میں ہونے والی فزکس کانفرنس میں 32 سائنس داں شریک ہوئے تھے، جب کہ 1980 میں ہونے والی فزکس کانفرنس میں شریک ہونے والے سائنس دانوں کی تعداد 800 تھی۔ امریکن فزیکل سوسائٹی (APS) 1899 میں قائم کی گئی۔ اس کے ممبروں کی تعداد 1920 میں 1300 تھی، 1980 میں اس سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد 30,000 تھی، اور 2020 میں اس کے ممبران کی تعداد 50,000 ہے۔

ان جدید تحقیقاتی کوششوں کا تعلق فلکیات (astronomy) اور پارٹکل فزکس وغیرہ سے ہے۔ ان علوم میں تحقیقات کے نتائج دیر میں نکلتے ہیں۔ تقریباً 50 سال بعد یا اس سے بھی زیادہ۔ یہ

ظاہر ایک بے فائدہ مد میں اتنی کثیر رقم خرچ کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے منصوبوں پر اعتراض کررہے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے امریکی پروفیسر راجر پنروز (Roger Penrose [b. 1931]) نے کہا ہے:

> Do economists not share with us the thrill that accompanies each new piece of understanding? Do they not care to know where we have come from, how we are constituted, or why we are here? Do they not have a drive to understand, quite independent of economic gain? Do they not appreciate the beauty in ideas? — A civilisation that stopped inquiring about the universe might stop inquiring about other things as well. A lot else might then die besides particle physics. (SUNDAY Weekly [Calcutta] Nov 30, 1980)

کیا اقتصادیات کے ماہرین اس وجد انگیز مسرت میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہیں، جو علم کے ہر نئے اضافے سے حاصل ہوتی ہے۔ کیا ان کو یہ جاننے کا شوق نہیں ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، ہماری پیدائش کیسے ہوئی ہے یا یہ کہ اس زمین پر ہم کیوں ہیں۔ کیا اقتصادی فائدہ سے ہٹ کر ان باتوں کو جاننے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ کیا وہ نظریات میں حسن کی قیمت کو نہیں سمجھتے۔ کوئی تہذیب جو کائنات کے بارے میں تحقیق سے رک جائے، وہ دوسری چیزوں کے بارے میں تحقیق کو بھی روک دے گی۔ اس کے بعد پارٹیکل فزکس کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں بھی موت کا شکار ہو کر رہ جائیں گی۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی حقیقت جاننے کا مسئلہ کس قدر ضروری ہے۔ وہ انسان جو خدا کی بنیاد پر کائنات کی تشریح نہیں کرنا چاہتا وہ بھی انتہائی بے تاب ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز پالے جس کی بنیاد پر وہ اپنی اور کائنات کی تشریح کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظر آنے والی کائنات اور اس کے اندر انسان جیسی ایک مخلوق کا موجود ہونا اس قدر حیران کن ہے کہ انسان اس کی ماہیت کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کوئی بھی دوسری چیز اس کو اس سوال سے بے نیاز کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ حتی کہ بڑی بڑی مادی ترقیاں بھی۔

انسان دیکھتا ہے کہ وہ ایک لامحدود کائنات میں ہے۔ اس کائنات میں تقریباً ایک کھرب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں لگ بھگ ایک کھرب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں، اور ہر ستارہ دوسرے ستارے سے اتنا زیادہ فاصلہ پر ہے، جیسے بحرالکاہل (Pacific Ocean) کے لق ودق سمندر میں چند کشتیاں ایک دوسرے سے دور دور تیر رہی ہوں۔ عظیم کائنات میں پھیلے ہوئے ستاروں کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہر ستارہ کا کوئی یک لفظی نام رکھا جائے، اور کوئی ان ناموں کو بولنا شروع کرے تو صرف تمام ناموں کو دہرانے کے لیے 300 کھرب (30 ٹریلین) سال کی مدت درکار ہوگی (پلین ٹرتھ، جنوری، 1981)۔

اس ناقابلِ قیاس حد تک عظیم کائنات میں انسان سب سے زیادہ حقیر مخلوق ہے۔ وہ کائناتی نقشے میں ان چھوٹے جزیروں سے بھی کم ہے، جو بہت چھوٹے ہونے کی وجہ سے عام طور پر دنیا کے نقشوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ انسان اپنے تمام چھوٹے پن کے باوجود کائنات کے فاصلوں کو ناپ رہا ہے۔ وہ طبیعیاتی ذروں سے لے کر کہکشاتی نظاموں تک کی تحقیق کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا ذہن رکھتا ہے، جو ماضی اور مستقبل کا تصور کر سکے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے، اور بالآخر اس عجیب وغریب ڈرامے کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ یہ سوالات ہر سوچنے والے انسان کے اوپر منڈلا رہے ہیں۔ وہ ان کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مگر انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب دور بینی مشاہدات اور لیبوریٹری کے تجربات میں ڈھونڈ رہا ہے۔ حالاں کہ ان سوالات کا جواب پیغمبر کے الہام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

جس کائنات میں اتنی زیادہ دنیائیں ہوں کہ صرف ان کا نام لینے کے لیے تین سو کھرب (30 Trillion) سال سے زیادہ مدت درکار ہو۔ اس کی حقیقت کو وہ انسان کیوں کر دریافت کر سکتا ہے، جو پچاس سال یا سو سال زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق ہی اس راز کو کھول سکتا ہے، اور اسی نے پیغمبر کے ذریعے اس کو کھولا ہے۔

مذہب کی طرف واپسی

امریکا کے ٹائم میگزین (8 اپریل 1966) کی کوراسٹوری (خصوصی مضمون) کا عنوان تھا ''کیا خدا مر چکا ہے'' یہ نصف صدی پہلے کی بات تھی۔ اب خود مغربی دنیا میں ایسی کتابیں اور مضامین مسلسل شائع ہورہے ہیں جن کا عنوان اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ماہنامہ اسپان (دسمبر 1984) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کی سرخی کے الفاظ یہ ہیں ''مذہب کی طرف واپسی''۔

یہ رپورٹ اس مضمون کے آخر میں نقل کی جارہی ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں میں مختصر وقفے کے بعد مذہب ازسرِ نو زندہ ہورہا ہے۔ کالجوں میں دینیات کی کلاس جو پہلے خالی رہتی تھی، اب بھری رہتی ہے۔ چرچ اور سیناگاگ (یہودی عبادت خانہ) میں جانے والوں کی تعداد کئی گناہ بڑھ گئی ہے۔ مذہبی لٹریچر پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مذہب کے نام پر کانفرنسیں کثرت سے منعقد کی جارہی ہیں۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں، یہاں مذہب میں دلچسپی کا حیرت ناک احیا ہوا ہے۔

ایک مغربی دانشور جس نے 1965 میں ''سیکولر شہر'' نامی کتاب میں بتایا تھا کہ لوگوں نے مقدس چیزوں میں اپنی دلچسپی کھو دی ہے، اب وہ اپنی دوسری کتاب ''سیکولر دنیا میں مذہب'' میں دکھا رہا ہے کہ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی ازسرِ نو بحال ہوگئی ہے۔ دانشور طبقہ جو عرصے سے شک کی بنا پر مذہب کو نظر انداز کیے ہوئے تھا، وہ مذہب کی طرف دوبارہ دیکھنے لگا ہے۔

ڈینیل بل نے لکھا ہے کہ 18 ویں صدی کے آخر سے لے کر 19 ویں صدی کے نصف تک تقریباً ہر ترقی پسند مفکر یہ خیال کرتا تھا کہ مذہب 20 ویں صدی میں ختم ہوجائے گا۔ یہ عقیدہ عقل کی طاقت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے دماغ سے اپنے مسائل کو حل کر لے گا، اور اس کے بعد مذہب اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ہم نے ٹکنالوجی کے ذریعے غیر

معمولی طاقت فطرت کے اوپر حاصل کرلی۔ اس کے باوجود 20 ویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی سب سے بھیانک صدی ہے۔

چونکہ انسان کے سیکولر خدا ناکام ہو گئے ہیں، وہ روایتی خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ دیکھنے لگا ہے۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں روایت دوبارہ مثبت قوت کے ساتھ ایجنڈا پر آ گئی ہے۔ مذہب کی طرف یہ واپسی حقیقتۃً فطرت کی طرف واپسی ہے۔ یعنی اس خدا کی طرف واپسی جس کا احساس اس کی فطرت میں پیوست ہے، نہ کہ اس خدا کی طرف جس کی نمائندگی وہ اپنے موروثی مذہب میں پا رہا ہے۔

ہارورڈ لاء اسکول کے پروفیسر آلن ڈرشووٹز (Alan Dershowitz [b. 1945]) نے کہا کہ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ میری نسل مذہب کی طرف واپس آئے۔ ہم وہ نسل ہیں جس کو ہر قسم کی آزادی اور ہر طرح کی چھوٹ حاصل تھی۔ مگر ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ اس آزادی کی کوئی جڑ نہیں۔ یہی بے جڑ ہونے کا احساس ہے، جو اکثر دانشوروں کو دوبارہ مذہب کی طرف لایا ہے۔ ایک دوسرے پروفیسر مسٹر کولس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خدا میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں روحانیت کی تلاش میں ہوں نہ کہ کسی خاص مذہب کو ماننے والا۔ میری زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ میں ٹھہر جاتا ہوں اور خدا کو پکارنے لگتا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ وہ خدا کون ہے، اور اس کی صورت کیا ہے تو میں تردد میں پڑ جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں انتشار ذہنی کا شکار ہوں۔ اگرچہ میں نہیں چاہتا کہ ذہنی انتشار میری زندگی پر پوری طرح چھا جائے۔

تبصرہ

یہ صورتِ حال جو غیر مسلم اقوام میں پیدا ہوئی ہے، یہی خود مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر بھی دین کی طرف از سرِ نو رجوع پیدا ہوا ہے۔ مگر اس رجوع کا تعلق کسی "عہد ساز مفکر" یا کسی "خدا رسیدہ بزرگ" سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر ایک زمانی مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم میں یکساں طور پر پیدا ہوا ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، بدھسٹ، وغیرہ سب کے یہاں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کا

کوئی فرق نہیں۔

اس نئی صورتِ حال کی وجہ مغربی انسان کی وہ مایوسی ہے، جو اس کو موجودہ صدی میں پیش آرہی ہے۔ بیسویں صدی عقلیت اور سائنس کی صدی تھی۔ جدید انسان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی عقل اور اپنی سائنس سے وہ سب کچھ حاصل کر لے گا، جس کی امید پہلے صرف مذہب سے کی جاتی تھی۔ مگر اس کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ انسان کی عقلیت نے اس کو صرف بے یقینی تک پہنچایا، اور اس کی سائنس ایٹمی جنگ کا سیاہ بادل بن کر اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ چوں کہ لوگوں کے سیکولر خدا ناکام ہو گئے۔ اس لیے لوگوں نے روایتی خدا کی طرف زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

اس طرح موجودہ صورتِ حال نے ہمارے لیے ایک نیا امکان کھولا ہے۔ اس نے خدا کے محفوظ دین (اسلام) کی تبلیغ واشاعت کا ایک نیا موافق میدان پیدا کر دیا ہے۔ آج کا انسان خدا اور مذہب کی تلاش میں نکلا ہے۔ مگر یہ تمام تر فطرت کے زور پر ہے۔ موجودہ مذاہب تحریف ہو جانے کی بنا پر اس کی تلاش کا حقیقی جواب نہیں ہیں۔ یہاں ضرورت ہے کہ اس کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تمھیں تلاش ہے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں موجود ہے۔ اسلام اسی مذہب کا غیر محرف ایڈیشن ہے جس کو تم محرف مذاہب میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہو۔

دنیا کے موجودہ حالات دیکھیے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو لا کر اپنی رحمت کے دروازے پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو مجبور کر کے انھیں دینِ حق میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان سے لوگوں کی ہدایت اتر چکی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ حق کو طالبانِ حق تک پہنچا دیں۔

A RETURN TO RELIGION

“There's no doubt about it”, says Harvey R. Cox, Professor of Divinity at the Harvard Divinity School, “There’s a tremendous resurgence of religious interest here. “It it not uncommon to see students wearing crosses or yarmulkes on campuses across the United States, and few hide the fact that they go to church or synagogue. Not just students, but the academic community in general, long a haven for skeptics, is now giving religion a

second look. Cox's bestselling 1965 book, The Secular City, suggested that people had lost interest in the sacred. His new book, Religion In The Secular City, describes the current revival in religious concern. A century that has seen the Gulag, the Holocaust, Hiroshima and the spread of nuclear arms has caused some who used to champion rationalism and science to humble themselves. Since their secular gods have failed, they are beginning to view more traditional gods with a new curiosity. "There is a reaction against extreme individualism and self, a preoccupation with and a search for roots with a capital R, which takes people back to religion," says Robert N. Bellah, Ford Professor of Sociology and Comparative Studies at the University of California at Berkeley."Tradition is back on the agenda with a positive force." It would have been hard to imagine a similar revival 20 years ago. On April 8, 1966, Time magazine asked on its cover: "Is God Dead?"Among intellectuals today, God is not pronounced dead easily. Science and religion are not viewed as necessarily incompatible, and logical attempts to disprove God's existence are viewed as somewhat arcane, All of this would have surprised our intellectual predecessors. At the end of the 18th and to the middle of the 19th century, almost every enlightened thinker expected religion to disappear in the 20th century," Daniel Bell said in a seminal lecture, "The Return of the Sacred," at the London School of Economics in 1977. "The belief was based on the power of reason." The theory was that man could use his mind to overcome his problems, and religion would wither away. But that has hardly been the case. "We've gained enormous power over nature via technology," Bell said in an interview. "And yet, the 20th century is probably the most dreadful period in human history." For intellectuals, according to Bell, there have always been secular alternatives to religious faith: rationalism and the belief in science; aestheticism and the belief in art; existentialism as expressed in the works of Kierkegaard and the early Sartre, and politics–the cults of Stalin, Lenin and Mao. Yet, one by one; those alternatives, according to Bell, have exhausted their power to move individuals. "It's ironic

that my generation should be the one coming-back to religion," says Alan Dershowitz, 45, professor of law at Harvard Law School."We were the generation that had all the freedom and all the choice." And yet, it is the rootlessness of much of that freedom that has brought so many intellectuals back to religion."I can't say to you I believe in God." says Coles, who might be described as a spiritual wanderer rather than as a believer in any particular faith."There are moments when I do stop and pray to God. But if you ask me who that God is or what kind of image He has. my mind boggles. I'm confused, perplexed, confounded. But I refuse to let that confusion be the dominant force in my life." (Span, Dec 1984, p. 26)

www.issuu.com/spanmagazine/docs/1984—12—cr/54 [accessed 01.04.2020]

جواہر لال نہرو کا واقعہ

پنڈت جواہر لال نہرو (1889-1964) بھارت کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ زندگی ایک نہایت پیچیدہ نظام ہے۔ ہم منصوبے بناتے ہیں، اور عمل کے نقشے مقرر کرتے ہیں۔ مگر کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ نتیجہ ہمارے سوچے ہوئے نقشہ کے مطابق نکلتا ہو۔ اکثر نامعلوم اسباب (unknown factors) ہمارے مفروضات پر بھاری ثابت ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مخفی طاقتیں ہیں، جو انسان کی تقدیر بناتی ہیں۔

ایک انسان جو خدا میں یقین نہ رکھتا ہو، وہ اتنا ہی کہہ سکتا تھا۔ مگر مذہب اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ بلاشبہ ایسی ایک مخفی طاقت ہے، جو انسان کی تقدیر بناتی ہے، اور یہ مخفی طاقت خدا ہے۔

معبود کی طلب

اندرن نکولائیف (Andriyan Grigoryevich Nikolayev) روس کا خلائی مسافر ہے۔ اس کی پیدائش 1929 میں ہوئی، اور وفات 2004 میں۔ 1962 میں اس نے پہلی مرتبہ خلا میں پرواز کیا۔ اس خلائی پرواز سے واپسی کے بعد 21 اگست 1962 کو ماسکو میں اس نے ایک پریس کانفرنس میں حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں اس نے اپنا خلائی تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا:

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں۔

انسان جیسی ایک مخلوق کے لیے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں، وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لیے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت براری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربے کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذباتِ محبت کو اس کے لیے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لیے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنا لے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لیے نثار کر دے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پا کر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پا کر گزرنا چاہیے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی

وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے، اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے، اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق (Creator) تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کے عجائبات (wonders) دیکھتا ہے، اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لیے ہوتا ہے، اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لیے۔

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو 15 میں امریکا کے جو تین خلاباز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز اِروِن (James Irwin [1930-1991]) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست 1972 کا وہ لمحہ میرے لیے بڑا عجیب تھا، جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی، اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لیے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا، بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون 27 اکتوبر 1972)۔

کرنل جیمز اروِن کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے، وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں (wonders) میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش جو دنیا ہے، اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے، سب کا سب حد درجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر ایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا، اور پہلی بار

وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامے میں اس کے خالق کو موجود پایا۔

ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، یہاں بھی ''خدا کی موجودگی'' کا تجربہ اسی طرح ہو سکتا ہے، جس طرح چاند پہنچ کر کرنل اِروِن کو ہوا۔ مگر لوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے، جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی دنیا کو اس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس ''خدا کی موجودگی'' کا تجربہ ہو۔ ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک اعلیٰ درجے کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینئر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کو اور اس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔ کائنات کی ہر تخلیق خالق کے وجود کی گواہی دیتی ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرلے۔ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا، ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لَمسِ ربانی (divine touch) کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا اپنی قدرت اور رحمت کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہوجائے۔

انکار سے اقرار تک

پروفیسر چندرو کرماسنگھی (Chandra Wickramasinghe[b. 1939]) سری لنکا کے ایک سائنس داں ہیں۔ وہ یونیورسٹی کالج، کارڈیف (برطانیہ) میں ریاضیات اورفلکیات کے استاد رہے۔ اپنے فن میں انھوں نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ پروفیسر سر فریڈ ہائل کے ساتھ 1962 سے ایک تحقیق میں لگے ہوئے تھے۔ تحقیق کا موضوع یہ تھا کہ زمین پر زندگی کا آغاز کس طرح ہوا۔ دونوں پروفیسروں نے اپنی تحقیق کے نتائج ایک کتاب کی صورت میں شائع کیے ہیں جس کا نام ہے ''ارتقاء خلا سے'':

Evolution from Space, Simon and Schuster, 1981, 176 pages

پروفیسر وکرما سنگھی نے تحقیق کا آغاز اس ذہن کے ساتھ کیا تھا کہ خالق کا تصور سائنس سے غیر مطابق ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اپنی تحقیق کے آخری نتائج سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ سائنسی تعلیم کے دوران شروع سے مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ سائنس کسی بھی قسم کی ارادی تخلیق کے نظریے سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ اس نظریے کو بے حد دکھ کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا۔ میرا ذہن مجھ کو جس طرف لے جارہا ہے، وہ میرے لیے سخت غیر اطمینان بخش ہے۔ مگر اس سے نکلنے کا کوئی منطقی راستہ موجود نہیں۔

دونوں سائنس دانوں نے الگ الگ اس کا حساب لگایا کہ اتفاقی طور پر زندگی شروع ہونے کا ریاضیاتی امکان کتنا ہے۔ دونوں کی آزادانہ تحقیق اس مشترک نتیجے پر پہنچی کہ اتفاقی پیدائش کا ریاضیاتی طور پر کوئی امکان نہیں۔ انھوں نے حساب لگا کر بتایا کہ اتفاقی پیدائش کا امکان اگر ''ایک'' مانا جائے تو اس کے مخالف امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کرنے کے لیے ایک کے دائیں طرف چالیس ہزار صفر لگانے ہوں گے۔ ''یہ تعداد موجودہ حجم اور عمر (15 بلین سال) کی کائنات میں اتنی ناقابلِ قیاس حد تک زیادہ ہے کہ مجھے صد فی صد یقین ہے کہ زندگی ہماری زمین پر اپنے آپ اچانک شروع نہیں ہوسکتی۔''

کیمیائی اتفاق سے اچانک زندگی کا شروع ہونا اس قدر زیادہ بعید بات ہے کہ وہ بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچنا بالکل معقول ہے کہ طبعیات کے وہ اوصاف جن پر زندگی کا انحصار ہے، وہ ہر اعتبار سے ارادی ہیں۔ وکرما سنگھی لکھتے ہیں ''سر فریڈ ہائل مجھ سے زیادہ برتر خالق کی طرف مائل تھے۔ میں اکثر اس کے خلاف ان سے بحث کرتا تھا۔ مگر میں نے پایا کہ میں استدلال کی تمام بنیادیں کھو رہا ہوں۔ اس وقت میں کوئی بھی عقلی دلیل نہیں پاتا، جس سے میں خدا کے نظریے کو باطل ثابت کرسکوں۔ اگر میں کوئی دلیل پاتا، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو تو میں اس کتاب کے لکھنے میں فریڈ کا شریکِ کار نہ ہوتا۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں واحد منطقی جواب یہی ہے کہ وہ تخلیق ہے، نہ کہ کوئی الل ٹپ قسم کا الٹ پھیر۔ میں اب بھی اس امید پر ہوں کہ کسی دن میں دوبارہ خالص مشینی توجیہہ پیش کرسکوں۔ ہم بحیثیت سائنس داں کے اس امید میں تھے کہ ہم کوئی راستہ پالیں گے۔ مگر موجودہ تحقیقی نتائج کے مطابق اس کی کوئی صورت نہیں۔ منطق اب بھی مایوسانہ طور پر اس کے خلاف ہے۔

میں ایک بدھسٹ ہوں۔ اگر چہ کوئی پر جوش نہیں۔ اس اعتبار سے یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ بدھزم ایک بے خدا مذہب ہے، جو اس بات کا دعوی نہیں کرتا کہ وہ تخلیق کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ بدھزم کے نظام میں خالق کا کوئی وجود نہیں۔ مگر اب میں پاتا ہوں کہ میں منطق کے ذریعے اسی مقام پر پہنچا دیا گیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ مخصوص کیمیائی مادوں میں وہ حد درجہ درست نظام کیوں کر پایا جاتا ہے، جس سے کائناتی سطح پر تخلیقات کا ظہور ہو۔

تبصرہ

پچھلی صدیوں میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ خدا کا وجود محض ایک ذاتی عقیدے کی چیز ہے۔ اس کا علمی طرزِ فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلسل ایسے شواہد مل رہے ہیں کہ انسان یہ ماننے پر مجبور ہو رہا ہے کہ خدا کا وجود ایک علمی وعقلی نظریہ ہے نہ کہ محض ایک بے دلیل عقیدہ۔

مگر سائنسی مطالعہ آدمی کو صرف اس مجرد حقیقت تک پہنچا رہا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ اس کے آگے یہ سوال ہے کہ خدا جب ہے تو اس کا انسان سے کیا تعلق ہے۔ مگر سائنس اس کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں دیتی اور نہ دے سکتی۔ یہ دراصل وہ مقام ہے جہاں سے مذہب کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ اصولی طور پر تمام مذاہب اس سوال کا جواب ہیں۔ مگر مذاہب کی موجودہ صورت بتاتی ہے کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔ کوئی مذہب اس لیے باطل قرار پاتا ہے کہ اس میں سرے سے خدا کا تصور ہی موجود نہیں۔ کسی کا حال یہ ہے کہ وہ کئی خداؤں کا مدعی ہے۔ حالاں کہ تمام علوم یہ ثابت کررہے ہیں کہ خدا اگر ہوسکتا ہے تو ایک ہوسکتا ہے۔ کئی خدا کا ہونا ممکن نہیں۔ کسی مذہب کے نظام میں ایسے نظریات جگہ پا گئے ہیں، جن کو انسانی ضمیر کبھی قبول نہیں کرسکتا۔ مثلاً انسانوں کے درمیان رنگ اور نسل کی بنیاد پر فرق۔ اسی طرح دوسری باتیں۔

علمی حقائق انسان کو خدا تک پہنچا رہے ہیں اور خدا کو ماننے کے بعد اسلام کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب علمی مطالعہ یہ بتا رہا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے تو بے خدا مذاہب اپنے آپ باطل ثابت ہوجاتے ہیں۔ جب کائناتی تحقیق یہ بتائے کہ اس کا پورا نظام ایک وحدت کے تحت چل رہا ہے تو ایسے مذاہب بے معنی ہوجاتے ہیں جو کائنات کے کئی خدا مانتے ہوں۔ ایسی حالت میں آدمی مجبور ہے کہ وہ اسلام کو اپنا مذہب بنائے جو نہ صرف خدا کے صحیح تصور پر مبنی ہے بلکہ واضح طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے۔

CONVERSION TO GOD

There wasn't much to agree on when two of Britain's most eminent scientists began researching into the origin of life. But on one point they were both quite clear—that the notion of 'Creator' is inconsistent with science. Today, Professor Sir Fred Hoyle, an agnostic of Christian background and Professor Chandra Wickramasinghe, an atheist Buddhist are changed men. They believe. What convinced both men were calculations they each did independently into the mathematical chances of life starting spontaneously. Each found that the odds against the spark of life igniting accidentally on Earth were staggering – in mathematical

jargon '10 to the power of 40,000.' If you write down the figure '1' and add 40,000 noughts after it, you have the figure. "That number is such an imponderable in the universe that I am 100 per cent certain that life could not have started spontaneously on Earth," says Wickramasinghe' who has worked with Hoyle since 1962. "It is quite a shock," says Wickramasinghe, Sri Lankan born Professor of Applied Mathematics and Astronomy at University College, Cardiff."From my earliest training as a scientist, I was very strongly brainwashed to believe that science cannot be consistent with any kind of deliberate creation. That notion has had to be very painfully shed. I am quite uncomfortable in the situation, the state of mind I now find myself in. But there is no logical way out of it." They did calculations based on the size and age of the universe (15 billion years) and found that the odds against life beginning spontaneously anywhere in space were '10 to the power of 30.' And as they say in their book, Evolution From Space: "Once we see that the probability of life originating at random is so utterly miniscule as to make it absurd, it becomes sensible to think that the favourite properties of physics on which life depends are in every respect deliberate. Wickramasinghe says: Fred was tending much more than I towards the higher intelligent Creator. I used to argue against it, but I found myself losing every argument. At the moment I can't find any rational argument to knock down the view which argues for conversion to God. If I could have found an argument even a filmsy one—I wouldn't have been party to what we wrote in the book. We used to have open minds; now we realise that the only logical answer to life is creation, and not accidental random shuffling. I still have a hope that one day I may go back to favour a purely mechanistic explanation—I say 'hope', because I still cannot come to terms with my conversion. My being a Buddhist—albeit not an ardent one—was never a problem, because it is an atheistic religion which dosen't profess to know anything about creation and doesn't have a creator built into it.' But I now find myself driven to this position by logic. There is no other way in which we can understand the precise ordering of the chemicals of the except to invoke the creations on a cosmic scale. "The two also believe that cellular life had already evolved to a high degree before the Earth was born, about three and-a-half billion years ago. "We received life with the fundamental biochemical problems already solved." says Wickramasinghe: We were hoping as scientists, that there would be a way round our conclusion— but there isn't. Logic is still hopelessly against that. (*The Hindustan Times,* September 6, 1981)

فطرت کی پکار

مسٹر یا کوف زلڈووچ (Yakov Zeldovich) روس کے مشہور سائنس داں ہیں۔ ان کی پیدائش 1914 میں ہوئی، اور وفات 1987 میں۔ وہ روس کی اکیڈمی آف سائنسز کے ممبر رہ چکے ہیں۔ سوویت یونین کے زمانے میں ماسکو سے شائع ہونے والے انگریزی ماہ نامہ اسپٹنک (Sputnik) شمارہ اگست 1987 میں ان کا ایک مضمون چھپا تھا، جس کا عنوان ہے:

Truth, Progress and the Human Soul

اس مضمون میں مسٹر زلڈووچ نے اپنے بارے میں اقرار کیا ہے کہ وہ ایک اتھیسٹ ہیں، وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں مذہب کی موجودگی ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ نیز یہ کہ روحانی تقاضے انسان کے شعور میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہیں:

Spiritual needs are deeply embedded in human consciousness.

انسانی فطرت کی یہ نوعیت اتنی واضح اور اتنی قطعی ہے کہ تمام سنجیدہ لوگوں نے اس کا اقرار کیا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک تمام انسان اس احساس کو لے کر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ملحد معاشروں میں پیدا ہونے والے بچے بھی اپنے آپ کو اس احساس سے خالی نہ کر سکے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقت کو مان لینے کے بعد صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس تقاضے کا جواب کیا ہے۔ مذکورہ سائنس داں کا کہنا ہے کہ اس کا جواب نیچرل سائنس ہے۔ مگر یہ جواب اپنی تردید آپ ہے۔ اس لیے کہ نیچرل سائنس ایک مادی چیز ہے، اور انسانی فطرت کا تقاضا ایک روحانی چیز۔ پھر ایک مادی چیز ایک روحانی سوال کا جواب کس طرح بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب صرف خداوند تعالی ہے۔ مخلوق اپنے خالق کی تلاش میں ہے، اور خالق کو پانے کے بعد ہی مخلوق کو سکون حاصل ہو سکتا ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔

اعتراف

چارلس ڈارون (1809-1882) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان دوسرے حیوانات ہی کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ یہ ایک بے حد عجیب نظریہ تھا۔ کیونکہ انسان انتہائی غیر معمولی حد تک دوسرے جانوروں سے مختلف ہے۔ پھر کیسے یہ ممکن ہوا کہ ایسا کا دماغ ترقی کرتے کرتے انسان کا دماغ بن جائے۔ یہ نظریہ اتنا بعید از قیاس تھا کہ ڈارون خود اپنے اس نظریے کے بارے میں حیرانی میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنی ڈائری (Darwin's Diary, April 1881) میں لکھا ہے:

Can the mind of man, which has, as I fully believe, been developed from a mind as low as that possessed by the lowest animal, be trusted when it draws such a grand conclusion?...I cannot pretend to throw the least light on such abstruse problems.

(www.pbs.org/wgbh/evolution/darwin/diary/1881.html. accessed on 01.04.2020)

انسان کا دماغ جس کے متعلق میرا کامل عقیدہ ہے کہ وہ اس معمولی دماغ سے ترقی کرکے بنا ہے جو انتہائی ادنیٰ حیوانات کو حاصل ہوتا ہے۔ کیا ایسے دماغ پر اس وقت بھروسہ کیا جاسکتا ہے، جب کہ وہ اتنے بڑے بڑے نتائج کررہا ہو۔ میں یہ دکھانے کی جھوٹی کوشش نہیں کروں گا کہ میں اس قسم کے مشکل مسائل پر کچھ بھی روشنی ڈال سکتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور کائنات کی تشریح کا مسئلہ ناقابلِ قیاس حد تک بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی انسان اپنی محدود عمر اور محدود صلاحیت کے ساتھ اس کی تشریح کا اہل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی اس کی تشریح کرنے بیٹھتا ہے وہ ہمیشہ احساسِ عجز کا شکار رہتا ہے۔ خواہ اپنی زبان سے وہ اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ یہ واقعہ اس کا ثبوت ہے کہ زندگی اور کائنات کی حقیقت بتانے کے لیے انسانی دماغ سے برتر ایک دماغ درکار ہے۔ یہ کام صرف خدا کرسکتا ہے، اور خدا نے پیغمبروں کے واسطے سے اس کو انجام دیا ہے۔ یہ ایک قرینہ ہے جو پیغمبرانہ ہدایت کی ضرورت اور واقعیت کو ثابت کرتا ہے۔

برتر ہستی کی تلاش

ڈاکٹر جے۔وی۔نارلیکر (Jayant Vishnu Narlikar) انڈیا کے عالمی شہرت یافتہ ماہر فلکی طبیعیات (astrophysicist) ہیں۔ ان کی پیدائش 1938 میں ہوئی۔ ان سے ایک انٹرویو میں کہا گیا کہ ''مذہبی توہمات'' کی پرستش میں سائنس داں دوسرے لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں۔حتی کہ کتنے سائنس داں دیوتاؤں تک میں عقیدہ رکھتے ہیں۔اس کے جواب میں ڈاکٹر نارلیکر نے کہا: ''مجھے یہ بات بے حد ناپسند ہے۔عملاً میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے سائنس داں، جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کررہے ہوتے ہیں تو وہ سائنٹفک نقطۂ نظر کو اپناتے ہیں۔مگر جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو وہ سائنٹفک طریقے کا بالکل استعمال نہیں کرتے۔مثال کے طور پر، مغرب کے اعلی تعلیم یافتہ لوگوں میں جیوتش پر عقیدہ پھیل رہا ہے۔یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔انسان کی اس خواہش نے اس کو جنم دیا ہے کہ وہ آسان اور فوری تسکین کو پالے۔یہ حقیقتاً ایک ذہنی سہارا ہے''۔(ٹائمس آف انڈیا 30 اپریل 1979)

کوئی شخص خواہ جاہل ہو یا عالم، کامیاب ہو یا ناکام، زندگی میں اس کو بار بار ایسے مرحلے پیش آتے ہیں، جہاں وہ اپنے عجز (helplessness) کا تجربہ کرتا ہے۔وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بے بس وجود ہے۔یہ چیز اس کو اپنے سے برتر ہستی کی تلاش کی طرف لے جاتی ہے، جو اس کی کمیوں کا بدل بن سکے۔مغرب کے اعلی تعلیم یافتہ لوگ جن کے لیے مادی مواقع کے تمام دروازے کھلے ہوتے ہیں، وہ جب اپنی ''ذہنی تسکین'' کے لیے مابعد الطبیعیات عقائد کا سہارا لیتے ہیں تو باعتبارِ حقیقت یہ فرضی نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اپنی فطرت کی خاموش پکار کا جواب ہوتا ہے۔ اگرچہ اپنی تلاش کا صحیح جواب نہ پانے کی وجہ سے وہ ''جیوتش'' جیسی توہماتی چیزوں میں اٹک جاتے ہیں— خدا کا وجود نہ صرف یقینی ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔

ذہین وجود کی تلاش

موجودہ زمانے کے سائنس دانوں نے جن چیزوں کی کھوج کی ہے، ان میں سے ایک بالائی تہذیب (alien civilizations) ہے۔ زمین پر انسانی تہذیب کے علاوہ کیا خلا میں کوئی اور تہذیب ہے، جو ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پچھلے 25 برسوں کے سائنسی مطالعے نے کافی حد تک یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ کائنات میں ہمارے علاوہ دوسری ''ٹکنکل سولائزیشن'' بھی ہوسکتی ہے۔

اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دانوں کو کائنات (universe) میں ماورائی ذہانت (extraterrestrial intelligence) کے آثار ملے ہیں۔ ان آثار کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ خدا کے وجود پر لوگوں کا یقین بڑھتا، مگر غیر خدا پرستانہ ذہن کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ ماورائی ذہانت کو انسانی ذہانت سمجھ رہے ہیں۔ جو حقیقۃً خدا کا وجود ثابت کررہی ہے، اس کو اس معنی میں لے رہے ہیں کہ کائنات میں کسی سیارہ پر انسانی تہذیب جیسی کوئی اور تہذیب موجود ہے۔ حالاں کہ کائنات میں ''ذہانت'' کے آثار کا ملنا، اور ذہانت کا نظر نہ آنا، یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ذہانت اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر انسانی اور غیر مرئی (invisible) ہے، نہ کہ انسان کی طرح دکھائی دینے والی۔

خلائی تہذیب

بیسویں صدی کے نصف سے مغربی دنیا ایک انوکھی تحقیق میں مشغول ہے۔ خلا میں زندہ مخلوقات کی آواز کو سننا (Listening for life in space)۔ بہ ظاہر اس تلاش کا محرک جدید علماء کا وہ مفروضہ ہے، جس کو ارتقا کہا جاتا ہے۔ مغربی علما نے زندگی کی جو ارتقائی توجیہہ کی ہے، اس کے مطابق لازم آتا ہے کہ وسیع خلا میں دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح زندگی کی انواع موجود ہوں، جس طرح وہ ہماری زمین پر پائی جاتی ہیں۔ خلا میں سفر کا ایک خاص مقصد ان زندگیوں سے ملاقات ہے۔ اس مفروضے پر ان کو اتنا یقین ہے کہ اس کا ایک خاص نام بھی دے دیا گیا ہے، یعنی بالائے خلا زندگی (extraterrestrial life)۔

اس کے علاوہ امریکا میں اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طرح کے بہت بڑے بڑے اینٹینا (antenna) لگائے گئے ہیں، جن کو عام زبان میں ریڈیائی کان (radio ears) کہتے ہیں۔ ان مشینوں سے بالائے خلا میں سگنل بھیجے جاتے ہیں، اور حساس قسم کے آلات ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ اوپر سے آنے والے متوقع سگنل کو سن سکیں۔ ان کوششوں پر ٹائم میگزین (21 مارچ 1983) میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے — اگر تم واقعۃً وہاں ہو تو اپنے دوستوں سے بولو:

If you are really there, please call your friends.

زمین پر زندگی اور شعور کا وجود ساری معلوم کائنات میں ایک انتہائی نادر اور استثنائی واقعہ ہے۔ چونکہ یہ شعور اپنا خالق آپ نہیں، اس لیے اس کا وجود لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ یہاں زندگی اور شعور کا ایک اور خزانہ زیادہ بڑی سطح پر موجود ہو، جو زمین کی زندگی اور شعور کا سرچشمہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندہ انسان کی موجودگی زندہ خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ جدید انسان اس امکان کو بالواسطہ انداز میں تسلیم کرتا ہے۔ البتہ وہ اس وجود کو خلائی زندگی قرار دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وجود ہماری ہی طرح کا ایک وجود ہے، نہ کہ ہم سے برتر کوئی وجود۔ وہ محض ایک تہذیب ہے، نہ کہ کوئی خالق اور مالک خدا۔

ذہین وجود

اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) موجودہ زمانے کا ایک ممتاز برٹش سائنس داں ہے۔ کائنات کے طویل مطالعے کے بعد اس نے کہا کہ میرا ریاضیاتی ذہن یہ بتاتا ہے کہ زمین کے ماورا بھی انسان کے مانند کوئی ذہین وجود ہونا چاہیے۔ اِس وجود کو اس نے اجنبی زندگی (Alien life) کا نام دیا ہے۔ اِس معاملے میں اسٹفن ہاکنگ کی سادہ منطق یہ ہے کہ ہماری کائنات میں تقریباً ایک سوبلین کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں کئی سوملین ستارے ہیں۔ اتنی بڑی کائنات میں یہ بات ناقابلِ قیاس ہے کہ صرف زمین وہ واحد سیارہ ہو، جہاں زندگی کا ارتقا ہوا ہے۔ میرے ریاضیاتی ذہن کے مطابق، ستاروں کی یہ عظیم تعداد ہی اِس نظریے کو پوری طرح معقول ماننے کے لیے کافی ہے:

Hawking has suggested that extraterrestrials are almost certain to exist. Hawking's logic on aliens is, for him, unusually simple. The universe has 100 billion galaxies, each containing hundreds of millions of stars. In such a big place, Earth is unlikely to be the only planet where life has evolved. "To my mathematical brain, the numbers alone make thinking about aliens perfectly rational."

(The Times of India, New Delhi, April 26, 2010, p. 17)

سیارۂ زمین پر ذہین وجود کا ہونا، اولاً جس چیز کو ثابت کرتا ہے، وہ استثنا (exception) ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اِس استثنا کی توجیہہ کیا ہے۔ اسٹفن ہاکنگ نے ارتقا (evolution) کے مفروضہ نظریے کو توجیہہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ مگر زیادہ معقول بات یہ ہے کہ اِس استثنا کی توجیہہ، مداخلت (intervention) کی بنیاد پر کی جائے۔ کیوں کہ مداخلت اپنے آپ میں ثابت ہے، اور جب مداخلت کو مان لیا جائے تو خالق کا وجود اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بہت سی نئی حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں۔ یہ نئی حقیقتیں خالق کے وجود کو ثابت کررہی تھیں، لیکن ارتقائی مفروضے کے تحت ان کو ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دے دیا گیا۔ مگر یہ محض ایک قیاس ہے، اور ایک قیاس سے دوسرے قیاس کو ثابت کرنا، بلاشبہ ایک غیر منطقی استدلال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بامعنی کائنات

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہماری قریبی کہکشاں ایک لاکھ سال نور (light years) کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کہکشاں کے اندر تین لاکھ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہمارا شمسی نظام اس کے مرکز سے 27 ہزار سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔ کہکشاں کے اکثر ستارے ممکن طور پر کسی نہ کسی قسم کے سیاروں (planets) کا سلسلہ رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر سیارے زندگی کے لیے غیر موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ستارے سے یا تو بہت زیادہ قریب ہیں یا بہت زیادہ دور ہیں۔ تاہم چوں کہ ستاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، خالص حسابی اعتبار سے یہ امکان ہے کہ بہت سے سورج جیسے ستارے ہوں، اور اسی طرح بہت سے زمین جیسے سیارے:

It is estimated that our Milky Way galaxy, which is 100,000 light years across, is composed of over 300,000 million stars. Our solar system is situated 27,000 light years away from the centre. Most of the stars are likely to have planets of some sort. But most of these planets will be unsuitable for life, because they are either too near or too far from their parent star. Yet because the number of stars is so great, there must, by sheer statistical probability, be many sun-like stars and earth-like planets. (*The Hindustan Times,* July 31, 1986, p. 9)

تاہم بے شمار سیاروں میں صرف زمین واحد سیارہ ہے، جہاں لائف سپورٹ سسٹم (life support system) پایا جاتا ہے۔ لائف سپورٹ سسٹم کیا ہے۔ وہ فطری اسٹرکچر اور نظام، جس کے ذریعے زندگی کے لیے لازمی چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔ مثلاً آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، کھانا، پانی، ناکارہ اشیا کی نکاسی، ٹمپریچر اور دباؤ کو مینج کرنا، وغیرہ:

The natural structures and systems that provides all of the elements essential for maintaining physical well being, as for example, oxygen, carbon dioxide, food, water, disposal of body wastes, and control of temperature and pressure, etc.

اسی فطری نظام کی وجہ سے زمین انسانوں جیسی زندہ مخلوق کے لیے قابلِ رہائش ہے۔ اس قسم کا کوئی اور سیاراتی نظام ابھی تک ساری کائنات میں معلوم نہ کیا جا سکا۔ موجودہ زمانے میں سائنس کا ایک مستقل شعبہ وجود میں آیا ہے، جس کو ایس ای ٹی آئی (SETI) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے— بالائے خلا ذہانت کی تلاش:

Search for Extra-Terrestrial Intelligence

زندگی کے ارتقائی نظریے کے تحت سائنس دانوں کا گمان ہے کہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی انسان جیسی ذہین مخلوق ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ارتقائی عمل عموم چاہتا ہے، ارتقائی عمل میں استثنا کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس فرضی قیاس پر جدید انسان کو اتنا زیادہ یقین ہے کہ ایک امریکن سائنسی مصنف اسحاق اسیمو ([1920-1992] Isaac Asimov) نے حساب لگا کر اعلان کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں چار سو ملین سیارے ایسے ہیں، جن میں پودے اور جانور پائے جاتے ہیں یا پائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ سب کا سب محض حسابی قیاس ہے۔

سورج ایک اوسط درجے کا ستارہ ہے۔ اس کا قطر (diameter) آٹھ لاکھ 65 ہزار میل ہے۔ وہ ہماری زمین سے تقریباً بارہ لاکھ گُنا بڑا ہے۔ سورج کی سطح پر جو حرارت ہے اس کا اندازہ بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر کیا گیا ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً نو کرور 30 لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ یا بڑھ جائے تو زمین پر انسان جیسی مخلوق کی آبادکاری ناممکن ہو جائے۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ سورج نصف کے بقدر ہم سے قریب ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس کی شدت سے کاغذ جلنے لگے۔ اس کے برعکس، اگر زمین اور سورج کا موجودہ فاصلہ دگنا سے زیادہ ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زمین پر زندگی جیسی چیز باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی، جب کہ موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آ جائے۔ مثلاً ایک ستارہ ہے، جس کی گرمی ہمارے سورج سے اسی ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو پوری زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

ماورائے انسان ذہانت

آج کل سائنسی حلقوں میں بالائے خلا ذہانت (extraterrestrial intelligence) کا بہت چرچا ہے۔ مختلف شعبوں میں ایسے شواہد سامنے آرہے ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ زمین کے علاوہ خلا کے دوسرے حصوں میں بھی ذہین ہستیاں، اغلباً انسان سے بھی زیادہ ذہین موجود ہیں۔ حتی کہ بہت سے سائنس داں اس سنہری صبح کے منتظر ہیں جب کہ وہ خلائی ریڈیو کا پیغام (extraterrestrial radio message) وصول کرسکیں گے۔

بالائے خلا ذہانت سے سائنس دانوں کی مراد یہ ہوتی ہے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی ہماری جیسی مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ دو امریکی فلکیات دانوں نے دعوی کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں 10 بلین ستارے ایسے ہیں، جو نظام شمسی کی مانند سیاراتی نظام رکھتے ہیں۔ ان نظامات میں زندگی کا وجود اسی طرح ممکن ہے جس طرح موجودہ زمین پر۔ اگرچہ عملاً ابھی تک ایسا کوئی کرہ دریافت نہیں ہوا جہاں زمین جیسی زندگیاں پائی جاتی ہوں۔

> Hypothetical extraterrestrial life that is capable of thinking, purposeful activity...more than 3,000 extrasolar planets have been detected...These efforts suggest that there could be many worlds on which life, and occasionally intelligent life, might arise. Searches for radio signals or optical flashes from other star systems that would indicate the presence of extraterrestrial intelligence have so far proved fruitless. (www.britannica.com/science/extraterrestrial-intelligence#ref283898 [on 4th Apr 2020])

سائنسی دریافتوں کا قافلہ بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سائنس ماورائے انسان ''ذہانت'' تک پہنچ چکی ہے۔ اگر کسی دن وہ دریافت کرے کہ یہ ماورائے انسان ذہانت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی زیادہ ممتاز ہے کہ اس کو انسان جیسی ذہین ہستی کہنے کے بجائے خدا کہنا زیادہ صحیح ہوگا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

سب سے بڑا المیہ

انسانی تاریخ کا شاید سب سے بڑا المیہ (tragedy) یہ ہے کہ انسان معرفتِ اعلیٰ کے حصول سے محروم رہا۔ خدا کی معرفت کا ذریعہ، خدا کی تخلیقات میں غور وفکر کرنا ہے۔ جدید سائنسی دور سے پہلے انسان تخلیقاتِ الٰہی کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ چنانچہ قدیم زمانے میں معرفتِ اعلیٰ تک پہنچنے کے لیے فریم ورک ہی موجود نہ تھا۔

موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب کے بعد انسان کو اعلیٰ فریم ورک حاصل ہوا۔ جس کی پیشگی خبر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ لیکن موجودہ زمانے میں جب یہ آفاقی یا سائنسی فریم ورک ظہور میں آیا تو عین اُسی وقت تمام دنیا کے مسلمان سیاسی ردِّعمل کے نتیجے میں منفی سوچ کا شکار ہو گئے۔ اس طرح وہ مثبت سوچ سے محروم رہے۔

قدیم زمانے کے انسان کے لیے سائنسی فریم ورک نہ ہونے کی بنا پر معرفتِ اعلیٰ تک پہنچنا مشکل تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنسی فریم ورک کے ظہور کے باوجود انسان معرفتِ اعلیٰ تک نہیں پہنچا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانے کا انسان مثبت سوچ سے محروم ہو گیا۔ یہ بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی محرومی تھی۔ اللہ کی معرفتِ اعلی کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ معرفت اعلی تک پہنچ سکے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منفی سوچ سے مکمل طور پر بچائے۔ وہ ہر حال میں مثبت سوچ میں جینے والا بنے۔ جو لوگ اس شرط کو پورا کریں وہ یقیناً معرفتِ اعلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی بات کو لے کر منفی سوچ کا شکار ہو گئے۔ وہ مثبت سوچ (positive thinking) پر قائم نہ رہ سکے۔ اس بنا پر وہ معرفت کا وعاء (container) نہیں بنے۔ معرفت اعلی سے محرومی کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔

میں کون ہوں

اس عظیم کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال جو ایک باشعور انسان کے ذہن میں آتا ہے، وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے، جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی اَن دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کررہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ آج یہ ایک مردہ نظریہ ہے، نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں، اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں۔ وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے، بلکہ ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے، اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے، اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک اتفاق، اور دوسرے قانونِ علّت (law of causation)۔

یہ توجیہہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دولاکھ ارب (دوسو ٹریلین) سال پہلے کائنات کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ستارے تھے، اور نہ سیارے، مگر فضا (space) میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا۔ بلکہ اپنے ابتدائی ذرّے یعنی برقیے (electrons) اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط (vast space) میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل (interruption) ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا، یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجیے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علم

ریاضی کے ذریعے ثابت ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادے کے اس بادل میں خفیف سا خلل (minutest disruption) واقع ہوا، جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہوگیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے، جن میں سے بعض کو ہم ستارہ، بعض کو سیارہ اور بعض کو نیبولا (nebula) کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ توجیہہ نہایت کمزور توجیہہ ہے، خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرحِ صدر حاصل نہ ہوسکا۔ یہ توجیہہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دعوی ہے کہ اس نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کرلیا ہے، اور اس محرکِ اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب وغریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا، جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے، اور نہ مادہ کے باہر۔ وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہہ کا یہ نہایت دل چسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعے سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے، جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے۔ مگر اس توجیہہ کی ابتدا ایک ایسے واقعے سے ہوتی ہے، جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے، جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریے کی پوری عمارت کھڑی کردی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے، جو انھوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہوجائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری

تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے، بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے، اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کردے۔

آخر وہ کون سی منطق تھی، جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کردیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی، جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظامِ شمسی کو وجود دیا۔ پھر وہ کونسی منطق تھی، جس سے ہمارے کرۂ ارض پر وہ عجیب وغریب تبدیلیاں ہوئیں، جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہوسکا، اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جاسکا ہے۔ پھر وہ کون سی منطق تھی، جو ایک خاص مرحلے پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی، اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی، جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبے میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کردیں، جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لیے درکار تھیں، پھر وہ کون سی منطق ہے، جو ان حالات کو ہمارے لیے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا، اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں، اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا تسلسل جاری رہے، اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعے میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی، اور اتنے عجیب وغریب طریقے پر مسلسل ارتقا کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہوگیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے، جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقے پر حرکت دے رہا ہے۔ اس توجیہہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے، اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا

جا سکتا۔ یہ توجیہہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ کیوں کہ حرکتِ اول کی توجیہہ کے لیے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے، مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہہ کے لیے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اصولِ تعلیل (principle of causation) پیش کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکتِ اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جس کے نتیجے میں ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح جیسے بچّے بہت سے اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے، اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے، بلکہ ناقابلِ تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علّت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جس صورت میں تاریخِ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلۂ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ متعین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آ گئی۔ یہ زمانہ سائنس داں انجینئروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانے میں جرمن ماہر طبیعات ہیلم ہولٹز (Helm Holtz [1821-1894]) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنسدانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی، مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے، اور بالآخر

تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصولِ تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے انسانی اختیار اور ارادے پر یقین کرنا محال بنا دیا۔ کیوں کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے۔ جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (living cell) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزاء جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں، کیوں کر اصولِ تعلیل کے دائرے سے باہر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ گمان کیا گیا۔ بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعوی کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے۔ یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن ([1642-1727] Isaac Newton)، باخ (JohannSebastian Bach [1685-1750]) اور مائیکل انجلو ([1475-1564] Michelangelo) کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے، اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصولِ تعلیل (principle of causation) کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (elusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوتِ کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے، جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مائیکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے۔ مگر سائنس دانوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے، جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لیے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل

طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے، جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (non-mechanical reality) کی طرف لیے جارہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارے میں یہ دونوں نظریے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے، اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی، بلکہ اور کمزور کردیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریے کی تردید کررہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہنچ گیا ہے، جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا نیا سفر شروع کیا تھا۔

معبود کی تلاش

یہ خالق کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد دوسری چیز جو انسان جاننا چاہتا ہے وہ یہ کہ ''میرا معبود کون ہے''۔ ہم اپنی زندگی میں صریح طور پر ایک خلا محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ اس خلا کو کیسے پر کریں۔ یہی خلا کا احساس ہے جس کو میں نے ''معبود کی تلاش'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احساس دو پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اپنے وجود اور باہر کی دنیا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو نہایت شدید جذبے ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا، شکر اور احسان مندی کا اور دوسرا، کمزوری اور عجز کا۔

ہم اپنی زندگی کے جس گوشے میں بھی نظر ڈالتے ہیں، ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہماری زندگی کسی کے احسانات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر دینے والے کے لیے ہمارے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے محسن پر قربان کرسکیں۔ یہ تلاش ہمارے لیے محض ایک فلسفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے، بلکہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ سوال محض ایک خارجی مسئلہ کو حل کرنے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہماری ایک اندرونی طلب ہے، اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

غور کیجیے، کیا کوئی سنجیدہ آدمی اس حقیقت کو نظر انداز کرسکتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعے کی حیثیت سے موجود ہے۔ حالاں کہ اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ

اپنے آپ کو ایک ایسے جسم میں پا رہا ہے، جس سے بہتر جسم کا وہ تصور نہیں کرسکتا۔ حالاں کہ اس جسم کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ اس کو ایسی عجیب وغریب قسم کی ذہنی قوتیں حاصل ہیں، جو کسی بھی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئی ہیں۔ حالاں کہ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے، اور نہ وہ کچھ کرسکتا ہے۔ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے، بلکہ عطیہ ہے۔ یہ عطیہ کس نے دیا ہے، انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے اس عظیم محسن کا شکر ادا کرسکے۔

پھر اپنے جسم کے باہر دیکھیے۔ دنیا میں ہم اس حال میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نہ ہم کو کائنات کے اوپر کوئی اختیار حاصل ہے کہ ہم اس کو اپنی ضرورت کے مطابق بنا سکیں۔ ہماری ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ مگر کسی ایک ضرورت کو بھی ہم خود سے پورا نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام سازوسامان کے ساتھ اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پیدا ہو، اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجیے، جس کے ذریعے سے ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات زبان کا ارتعاش بن کر دوسرے کے کان تک پہنچیں اور وہ ان کو قابلِ فہم آوازوں کی صورت میں سن سکے۔ اس کے لیے ہمارے اندر اور باہر بے شمار انتظامات کیے گئے ہیں، جن میں سے ایک وہ درمیانی واسطہ ہے، جس کو ہم ہوا کہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ بولتے ہیں، وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں، جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں، اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہنچنے کے لیے درمیان میں ہوا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو آپ میرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے، مگر میری آواز نہ سنیں گے۔ مثال کے طور پر ایک بند فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال دیا جائے، اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں

گے،مگراس کی آواز بالکل سنائی نہ دے گی۔ کیوں کہ گھنٹی کے بجنے سے جوارتعاش پیدا ہوتا ہے،اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لیے فانوس کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر یہ ذریعہ بھی ناکافی ہے۔ کیوں کہ ہوا کے ذریعے ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لیے کارآمد ہے، وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر آواز صرف ہوا کے ذریعہ پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔مگر قدرت نے اس کے لیے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے۔ یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ وائرلیس (wireless) پیغامات میں اسی طریقے سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی اسپیکر ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکروفون کے قریب آواز نکالتا ہے تو مائکروفون آواز کو جذب کر کے اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے، اور تار کے ذریعے اسی کو آلۂ نشر یا ٹرانس میٹر تک بھیج دیتا ہے، آلاتِ نشر آواز کے پہنچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے، اور لمحے بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وائرلیس موجیں (wireless waves) ہیں، جن کو ہمارے ریڈیو سیٹ کی آواز گیر مشین قبول کر کے بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے، اور پھر ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

یہ ان بے شمار انتظامات میں سے ایک ہے،جس کو میں نے بیان نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا صرف نام لیا ہے۔ اگر اس کا اور دوسری چیزوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو اس کے لیے کروروں صفحے درکار ہوں گے، اور پھر بھی ان کا بیان ختم نہ ہوگا۔

یہ عطیات جن سے ہر آن آدمی دوچار ہو رہا ہے، اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انسان جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب کس نے اس کے لیے مہیا کیا ہے۔ ہر آن جب وہ کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے،

اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو پائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔ محسن کے احسانات کو ماننا، اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا، اور اس کی خدمت میں اپنے بہترین جذبات کو نذر کرنا یہ انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو اپنی زندگی اور کائنات پر غور کرتا ہے، اس کے اندر نہایت شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ پھر کیا اس جذبے کا کوئی جواب نہیں ۔ کیا انسان اس کائنات کے اندر ایک یتیم بچہ ہے، جس کے اندر امنڈتے ہوئے جذبات محبت کی تسکین کے لیے کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ کیا یہ ایک ایسی کائنات ہے، جہاں احسانات ہیں مگر محسن کا پتہ نہیں۔ جہاں جذبہ ہے، مگر جذبے کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ معبود کی تلاش کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے حالات فطری طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ کائنات کے اندر اس کا کوئی سہارا ہو۔ اگر ہم آنکھ کھول کر دیکھیں تو ہم اس دنیا میں ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہیں۔ ذرا اس خلا کا تصور کیجیے جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کی گولائی تقریباً 25 ہزار میل ہے۔ اور وہ ناچتے ہوئے لٹو کی مانند اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر 24 گھنٹے میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کرور ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرہ میں نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

خلا کے اندر اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لیے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازے کے مطابق رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہو جائے، جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دیے گئے ہوں۔ اسی کے ساتھ مزید انتظام یہ ہے کہ زمین کی کشش ہم کو کھینچے ہوئے ہے، اور اوپر سے ہوا کا زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعے جو دباؤ پڑ رہا ہے، وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دباؤ۔ ان حیرت انگیز انتظامات نے ہم کو خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی زمین کے چاروں طرف قائم کر رکھا ہے۔

پھر ذرا سورج پر غور کیجیے۔ سورج کی جسامت آٹھ لاکھ 65 ہزار میل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا دہکتا ہوا سمندر ہے، جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے، اگر اس کے بجائے وہ اس کے نصف فاصلہ پر ہو تو سورج کی گرمی سے چیزیں جلنے لگیں، اور اگر وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلے پر آجائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج ہے، جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس کو ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دور چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے، اور قریب آجائے تو ہم سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں۔

پھر ذرا اس کائنات کی وسعت کو دیکھیے، اور اس قوتِ کشش پر غور کیجیے، جو اس عظیم کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ ماہرینِ فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ اس کو کائنات کے گرد ایک چکر طے کرنے میں کئی ارب برس درکار ہوں گے۔ یہ نظام شمسی جس کے اندر ہماری زمین ہے، بہ ظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، مگر پوری کائنات کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اس سے بہت بڑے بڑے بے شمار ستارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں بہت سے اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا پورا نظام شمسی اس کے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جو قوتِ کشش ان بے شمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کی عظمت کا تصور اس سے کیجیے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، اور اس کی وسیع ترین فضا میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے، یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لیے کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانکے ہوئے ہیں، اسی طرح دھاتی تاروں سے کرۂ ارض ڈھک جاتا۔

ہماری زندگی بالکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے، جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ انسان کی

زندگی کے لیے دنیا میں جو انتظامات ہیں، اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، وہ اتنے بلند پیمانے پر ہورہے ہیں، اور ان کو وجود میں لانے کے لیے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان خود سے انھیں وجود میں لانے کا تصور نہیں کرسکتا۔ موجودات کے لیے جو طریقِ عمل مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقرر کرنا تو درکنار اس پر کنٹرول کرنا بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر کائنات کی غیر معمولی قوتیں میرے ساتھ ہم آہنگی نہ کریں تو میں زمین پر ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس کے اوپر ایک متمدن زندگی کی تعمیر تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسی ایک کائنات کے اندر جب انسان اپنے حقیر وجود کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بے بس محسوس کرنے لگتا ہے، جتنا کہ سمندر کی موجوں کے درمیان ایک چیونٹی اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کررہی ہو۔ وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی ہو، جو اس اتھاہ کائنات میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے، جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو، اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کرسکے۔

یہ دو جذبے ہیں، جن کو میں نے معبود کی تلاش کا عنوان دیا ہے۔ معبود کی تلاش دراصل ایک فطری جذبہ ہے جس کا مطلب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے، جو آدمی کی محبت اور اس کے اعتماد کا مرکز بن سکے۔ انسان کے اندر تلاش کا یہ جذبہ جو ابھرتا ہے، اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے، جو ساری کائنات پر محیط ہو۔ اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خطہ میں نہیں مل سکتا۔ یہ چیزیں ایک سماج کی تعمیر میں مدد دے سکتی ہیں۔ مگر وہ انسان کی تلاشِ معبود کے جذبے کی تسکین نہیں بن سکتیں۔ اس کے لیے ایک کائناتی وجود درکار ہے۔ انسان کو اپنی محبتوں کے مرکز کے لیے ایک ایسا وجود چاہیے، جس نے کائنات (universe) کو بنایا ہو۔ اپنے سہارے کے لیے اسے ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے، جو کائنات کے اوپر حکمراں ہو۔ جب تک انسان ایسے ایک وجود کو نہیں پائے گا، اس کا خلا (vacuum) بدستور باقی رہے گا، کوئی دوسری چیز اسے پُر (fill) کرنے والی نہیں بن سکتی۔

انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش کا تیسرا جزء اپنے انجام کی تلاش ہے۔ آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، اور کہاں جائے گا۔ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے، وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی۔ وہ موجودہ محدود زندگی کے مقابلے میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے، مگر نہیں جانتا کہ وہ اس کو کہاں پائے گا۔ اس کے اندر بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات ہیں جو دنیا میں بری طرح پامال کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ سوالات کس طرح انسان کے اندر سے ابلتے ہیں، اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے، اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل مناسب ہوگی۔

ماہرینِ حیاتیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے، یعنی دو لاکھ ارب سال (200 ٹریلین سال)۔ اس سے پہلے کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی، پھر اس میں حرکت ہوئی، اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے، جس کو ہم ستارے، سیارے، اور نیبولا (nebula) کہتے ہیں۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے مہیب گولے کی شکل میں نامعلوم مدت تک فضا میں گردش کرتے رہے۔ تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا ستارہ فضا میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا، جو اس وقت اب سے بہت بڑا تھا۔ جس طرح چاند کی کشش سے سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں، اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے ہمارے آفتاب پر ایک عظیم طوفان برپا ہوا، زبردست لہریں پیدا ہوئیں، جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوئیں، اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو، اس کی قوتِ کشش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست گیسی لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں نکل گئے۔ یہی بعد کو ٹھنڈے ہو کر نظامِ شمسی میں سورج کے گرد چکر لگانے والے اجسام (objects) بنے۔ اس وقت یہ سب ٹکڑے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں، اور ان ہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

زمین ابتداءً ایک شعلے کی حالت میں سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔ مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، یہ عمل کروروں برس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہوگئی۔ مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی، جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے، اور گھٹاؤں کی شکل میں اس کی فضا کے اوپر چھا گئے۔ پھر یہ بادل برسنا شروع ہوئے اور ساری زمین پانی سے بھر گئی۔ زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا ہو گیا تھا، مگر اس کا اندرونی حصہ اب بھی گرم تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سکڑنے لگی۔ اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پر دباؤ پڑا، اور وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہوگئیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ گئے، اس طرح بحری طوفانوں، خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں سال گزر گئے۔ ان ہی زلزلوں سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور کچھ حصہ دب گیا۔ دبے ہوئے حصوں میں پانی بھر گیا اور وہ سمندر کہلائے، اور ابھرے ہوئے حصوں نے براعظم کی صورت اختیار کی بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوا کہ بڑی بڑی اونچی باڑھیں سی بن گئیں، یہ دنیا کے پہلے پہاڑ تھے۔ ماہرینِ ارضیات کا خیال ہے کہ ایک ارب 23 کرور سال ہوئے، جب پہلی بار زمین پر زندگی پیدا ہوئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے، جو پانی کے کنارے وجود میں آئے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ کئی ہزار سال تک زمین پر صرف جانور رہے۔ اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس اگنا شروع ہوئی۔ اس طرح لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے، یہاں تک کہ انسانی زندگی کے لیے حالات سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔

اس نظریے کے مطابق، انسان کی ابتدا پچھلے تین لاکھ سال سے ہوئی ہے۔ یہ مدت بہت ہی کم ہے۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کیے ہیں، ان کے مقابلے میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔ ایک طرف اس واقعے کو سامنے رکھیے، اور پھر اس حقیقت پر غور کیجیے کہ

کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ زمین و آسمان کی اربوں اور کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز انسان جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے، جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے، اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں۔ ہمارا وجود جن مادی اجزاء سے مرکب ہے، ان کی عمر تو اربوں اور کھربوں سال ہو، اور وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں۔ مگر ان مادی اجزاء کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے، وہ صرف سو برس زندہ رہے۔ جو کائنات کا حاصل (finest product) ہے، وہ کائنات سے بھی کم عمر رکھتا ہے۔ تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا صرف اس لیے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دنوں کے لیے پیدا کر کے ختم کر دیا جائے۔

زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے، جو طول وعرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، مگر حقیقت یہی ہے۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی، انسان کی نسل اپنے کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لیے پڑی رہے گی، دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان کی قسم کی کوئی نسل آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور چکر کرتا رہے گا، کائنات کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثے کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبانِ حال سے بتائے گا کہ یہ انسانی نسل کی قبر ہے، جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

کیا انسان کی قیمت بس اسی قدر ہے، مادہ کو کوٹیے، پیٹیے، جلائیے، کچھ بھی کیجیے، وہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ مگر انسان جو مادہ سے برتر مخلوق ہے، کیا اس کے لیے بقا نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے، کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے ختم

کیا جاسکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہا (culmination) بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے ننھے سے وطن میں چند دنوں کے لیے پیدا ہو، اور پھر فنا ہو کر رہ جائے۔ تمام انسانی علم اور ہماری کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں، اور کائنات اسی طرح باقی رہ جائے گویا انسانی نسل کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔

اس سلسلے میں دوسری چیز جو صریح طور پر محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ اگر زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے تو یہ ایک ایسی زندگی ہے، جس میں ہماری امنگوں کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے، کسی کو بھی موت پسند نہیں، مگر اس دنیا میں ہر پیدا ہونے والا جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے۔ آدمی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزارے، مگر حقیقی معنوں میں کیا کوئی شخص بھی ایسی زندگی حاصل کرسکتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملے، وہ اپنی ساری تمناؤں کو عمل کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر اس محدود دنیا میں وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، یہ کائنات اس کے لیے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے، وہ ہر چند قدم کے بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، کائنات صرف ایک حد تک ہمارا ساتھ دیتی ہے، اس کے بعد ہم کو مایوس اور ناکام لوٹا دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی محض غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے، جو دراصل اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی، اور جو بہ ظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پروا ہے۔ کیا ہمارے تمام جذبات وخیالات اور ہماری تمام خواہشیں غیر حقیقی ہیں، جن کا واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں، اور ہمارے ذہنوں میں بالکل الل ٹپ طریقے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے، اور جن کو اپنے سینے میں لیے ہوئے وہ اس حال میں دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں حاصل نہ کرسکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں۔ کیا وہ انسانوں کے ذہن میں

بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں، جن کے لیے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے، اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ایسا وجود ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں، یا بیا گھونسلے بناتا ہے۔ مگر ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں خوراک جمع کر کے رکھنا چاہیے تاکہ کل ان کے کام آسکے یا ایسا گھر بنانا چاہیے، جو موسموں کے ردوبدل میں تکلیف سے بچائے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ موقع ملنا چاہیے، جانوروں کے لیے زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے، کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ کل کا تصور جو انسان میں پایا جاتا ہے، اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے۔ انسان ''کل'' چاہتا ہے مگر اس کو صرف ''آج'' دیا گیا ہے۔

اسی طرح جب ہم سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک خلا کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف مادی دنیا ہے، جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے، اور اس کی ہر چیز اپنے مقرر راستے پر چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادی دنیا ویسی ہی ہے، جیسی کہ اسے ہونا چاہیے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔

ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے، اور دونوں اس حال میں مر جاتے ہیں کہ ایک ظالم ہوتا ہے، اور دوسرا مظلوم۔ کیا ظالم کو اس کے ظلم کی سزا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ دیے بغیر دونوں کی زندگی کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔

ایک شخص سچ بولتا ہے اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی

زندگی مشکل کی زندگی بن جاتی ہے، دوسرا شخص جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہے، اور جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کرلیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی زندگی نہایت عیش وعشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہوجائے تو کیا دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالتی ہے، اور اس کے وسائل وذرائع پر قبضہ کرلیتی ہے۔ اس کے باوجود دنیا میں وہی قوم نیک نام رہتی ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس نشر واشاعت کے ذرائع ہیں، اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف رہتی ہے۔ کیوں کہ اس کی آہ کے لیے دنیا کے کانوں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کیا ان دونوں کی صحیح حیثیت کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔

دو اشخاص یا دو قوموں میں ایک مسئلے پر اختلاف ہوتا ہے، اور زبردست کش مکش تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو برسرحق کہتے ہیں، اور ایک دوسرے کو انتہائی بُرا ثابت کرتے ہیں۔ مگر دنیا میں ان کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوتا، کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے، جو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرسکے۔ موجودہ دور کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو خودسری کا دور کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے، خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے، مگر ہر شخص پوری قوت کے ساتھ آواز لگا کر اپنے کو صحیح ثابت کررہا ہے۔ اخبارات میں لیڈروں اور حکمرانوں کے بیانات دیکھیے۔ ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس فریب کا پردہ کبھی چاک ہونے والا نہیں ہے۔

یہ صورتِ حال صریح طور پر ظاہر کررہی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک ایسی دنیا چاہیے، جہاں ہر ایک کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔ مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کوئی خلا ہے، اس کو پُر کرنے کے اسباب موجود ہیں۔ مادی دنیا میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس، انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ جس قدرت نے مادّی دنیا کو مکمل حالت میں ترقی دی ہے، کیا اس کے پاس انسانی دنیا کا خلا پر کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا

اور بعض کو برا سمجھتا ہے۔ ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ اس کو ہونا چاہیے، اور کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ اس کو نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ہماری فطری خواہش کے علی الرّغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے، جس کو انسانی فطرت برا سمجھتی ہے۔ انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنی رکھتی ہے کہ کائنات کی تعمیر حق پر ہوئی ہے۔ یہاں باطل کے بجائے حق کو غالب آنا چاہیے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا۔ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے، کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

یہی وہ سوالات ہیں، جن کے مجموعے کو میں نے اوپر انسانیت کے ''انجام کی تلاش'' کہا ہے۔ ایک شخص جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر نہایت شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زندگی اگر یہی ہے، جو اس وقت نظر آ رہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے۔ وہ ایک طرف دیکھتا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کائنات میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے۔ گویا سب کچھ صرف اسی کے لیے ہے، دوسری طرف انسان کی زندگی اس قدر مختصر اور اتنی ناکام ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سوال کے سلسلے میں آج لوگوں کا رجحان عام طور پر یہ ہے کہ اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا فضول ہے۔ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، اور حقیقت پسندی یہ ہے کہ زندگی کا جو لمحہ تمہیں حاصل ہے اس کو پر مسرت بنانے کی کوشش کرو۔ آئندہ کیا ہوگا یا جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صحیح ہے یا غلط، اس کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس جواب کے بارے میں کم از کم بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں، انھوں نے ابھی انسانیت کے مقام کو نہیں پہچانا، وہ مجاز (illusion) کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ واقعات انھیں ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر وہ چند روزہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لیے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرے، مگر نادان انسان روشنی کے بجائے اس کے سایے (shadow) کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمہارے لیے نامکمل ہے، دوسری مکمل دنیا کی کھوج لگاؤ۔ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے، ہم کو مکمل

دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ زندگی کا ایک انجام آنا چاہیے۔ مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں، اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالاں کہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے، جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔ اگر فی الواقع زندگی کا کوئی انجام ہے تو وہ آکر رہے گا، اور کسی کا اس سے غافل ہونا، اس کو روکنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو کل زندگی سمجھنا، اور صرف آج کو پر مسرت بنانے کی کوشش کو اپنا مقصد بنا لینا بڑی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس نقطۂ نظر کی لغویت فوراً واضح ہو جاتی ہے۔ ایسا فیصلہ وہی کر سکتا ہے، جو حقیقتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور بالکل بے سمجھی بوجھی زندگی گزارنا شروع کر دے۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو کائنات کو دیکھتے ہی نہایت شدت کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے، مگر اس کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہونا چاہیے، مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ ہم کسی کے احسانات سے ڈھکے ہوئے ہیں، اور مجسم شکر وسپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں، جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں۔ مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں۔ ہم کو ایک ایسی پناہ کی تلاش ہے، جہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکیں۔ مگر ایسی کوئی پناہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور اپنی عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو، اور انسان جو کائنات کا خلاصہ (finest product) ہے، اس کی عمر صرف چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے، مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔ پھر سب سے زیادہ سنگین تضاد وہ ہے، جو مادی دنیا اور انسانی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مادی دنیا انتہائی طور پر مکمل ہے۔ اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا، مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا

ہے۔ انسان کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اگر پٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو اس سے انسان خوش ہوتا ہے۔ مگر ایک انسان دوسرے انسان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

انسان کی نارسائی

یہ سوالات ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ اندر سے بھی ابل رہے ہیں، اور باہر سے بھی ہمیں گھیرے ہوئے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جواب کیا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا سوال ہے، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمیں زندگی تو مل گئی، مگر اس کی حقیقت ہمیں نہیں بتائی گئی ہے۔

اس حقیقت کی دریافت کے لیے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور ہمارے تجربے کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں اب تک ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے، اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرے میں محدود ہے، جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہمارا علم نامکمل ہے، ہمارے حواس خمسہ (five senses) ناقص ہیں۔ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ میدہ اور کالک کو اگر ملا یا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے، اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے، وہ اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے، اس کے مشاہدے کے پیمانے میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔

نوعِ انسانی کی زندگی اُس زمانے کے مقابلے میں جب کہ یہ کرۂ ارض وجود میں آیا، اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں نہیں آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ خلا میں ایک قطرہ کے برابر بھی

نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارے میں جو خیال آرائی کرتا ہے، اس کو اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہوجاتی ہے، جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں کہ سورج، سائنس داں کے اندازے کے مطابق، 4.603 بلین سال سے موجود ہے۔ اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں، سائنس داں کے اندازے کے مطابق، 4.543 بلین سال ہے، اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کرور سال گزر چکے ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں زمین پر ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانے کا ایک بہت حقیر (tiny) جزء ہے، جو کہ دراصل کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لیے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نا معلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے، جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت لامحدود ہے، اور اس کو سمجھنے کے لیے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں۔ ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعے کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامی اس کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اس طرح ہمارا علم اور ہمارا مطالعہ ہم کو ایک ایسے مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں، جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں۔ ایسے سوالات جو لازمی طور پر اپنا جواب چاہتے ہیں۔ جن کے بغیر انسانی زندگی بالکل لغو اور بے کار نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم ان پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان کا جواب معلوم نہیں کرسکتے۔ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جس سے حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ اور وہ ذہن ہمیں حاصل نہیں ہے، جو براہِ راست حقیقت کا ادراک کرسکے۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

مشہور جرمن مفکر فریڈرش انگلس (Friedrich Engels [1829-1895]) نے کہا ہے — ''آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ وسیاست کے مسائل پر غور کرسکتا ہے۔'' مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے کہ ''میں کیا ہوں؟ یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی؟'' یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں۔

آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں۔ سورج اس کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے، مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے، مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو، اور کیوں ایسا کر رہی ہو؟ وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں، اور کس لیے اس دنیا میں آ گیا ہوں؟ ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے۔ مگر انسان بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدّت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے۔ مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردّ عمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری، جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہوگئی۔ اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے نام اپنے خط میں اس طرح لکھتا ہے:

''میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہوجائے۔ جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے، میں تمھارے عقیدے کو

قبول نہیں کرسکتا۔ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آرہا ہے۔ میری آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل وجان سے متمنی ہوں اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے یہ روح القدس کی جھلک ہے۔''

At the age of nineteen, Engels wrote as follows: "I pray every day; almost all day long I pray that the truth may be given to me. I have done this since doubts assailed me, but still I cannot return to our faith...I write these lines with tears in eyes, it is hard for me to control my emotion, but nevertheless I feel that I will not be lost, that I will find God, toward whom I aspire with all my heart." (David Riazanov: *Essays on the History of Marxism*, p. 36, copied from "Max Eastman: *Marx, Lenin and the Science of Revolution*," p. 148, accessed from Google Book, 07.04.2020)

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں اُبھرا تھا۔ مگر اس کو تسکین نہ مل سکی، اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے۔ وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ ''خدا میرا خالق ہے اور میں اس کا بندہ ہوں۔'' یہ ایک خاموش عہد ہے، جو ہر شخص اوّل روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے۔ اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا اسے پالے۔ اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو، جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کردے۔

15 اگست 1947 کو جب ہندستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کران قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ یہ آنسو دراصل ''آزادی کی دیوی'' کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا۔ یہ اپنے معبود کو پالینے کی خوشی تھی، جس کے لیے انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک لیڈر جب ''قوم کے باپ'' کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے، اوراس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے، جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لیے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے۔ ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے، اوراس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس لیے ابتداءً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے۔ اس کا پہلا رخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے۔ مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں، اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہوجاتا ہے تو اس میں اس کو لذّت ملنے لگتی ہے۔ برٹرینڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹّر مذہبی آدمی تھا۔ وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا۔ ''تمھاری پسندیدہ دعا کون سی ہے؟' چھوٹے رسل نے جواب دیا۔'' میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوتا ہوں۔'' اس زمانے میں خدا برٹرینڈ رسل کا معبود تھا۔ لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی، اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے۔ اور بالآخر برٹرینڈ رسل ایک ملحد انسان بن گیا۔ جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ تھے۔ 1959ء کا واقعہ ہے۔ بی بی سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا : ''کیا آپ نے

مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے۔'' رسل نے جواب دیا :
''جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ابدی دنیا تھی۔ وقت کی قید سے آزاد دنیا۔ مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا۔''

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بتانے سے انکار کر دیا۔ مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا، اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا۔ وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا — یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لیے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں، جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے — ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی؛ کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا، جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں، وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ''الٰہ'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے۔ انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے اِلٰہوں (معبودوں) کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ کیونکہ الٰہ کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں جیسے کوئی بچے سے محروم ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبا لے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے۔ ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے، جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے 1935ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمّل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا: ''میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب

ختم ہوگیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کرسکتا۔ کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔''
(Nehru, An Autobiography, London, p. 597)

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصے پر بلا شرکت حکومت کررہے ہیں، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا، اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتابِ زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں، جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا، جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے۔ جنوری 1964 کے پہلے ہفتے میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی، جس میں ہندستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا : ''میں ایک سیاستدان ہوں، اور مجھے سوچنے کے لیے وقت کم ملتا ہے۔ پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لیے ہے، ہم کیا ہیں اور کیا کررہے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر کو بناتی ہیں۔'' (National Herald, 6 January, 1964)

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کے روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے، جنھوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا۔ دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کردیتی ہے، اور انھیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (Michael Brecher [b. 1925]) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی۔ نئی دہلی کی ایک ملاقات میں 13 جون 1956ء کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا : ''آپ مختصر طور پر مجھے بتائیے کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لیے کیا چیزیں ضروری

ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے۔‘‘

جواہر لال نہرو نے جواب دیا: ’’میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار (moral standards) کہہ لیجیے۔ یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وہ باقی نہ رہیں تو تم مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے ... میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے الگ کر کے بہت اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔‘‘(Nehru: A Political Biography, London 1959, pp. 607-08.)

یہ سوال وجواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدّت سے گرفتار ہے۔ افراد کو دیانت واخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے۔ سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے، جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے۔ زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے۔ وہ زندگی کے لیے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے۔ یہی وہ تنہا بنیاد ہے، جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

توحید کا تصور اسلام میں

کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق اس کو بنایا ہے، اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ جس طرح ساری کائنات خدا کی اطاعت کر رہی ہے، اسی طرح انسان کے لیے بھی صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا فرماں بردار بن کر زندگی گزارے۔ تمام انبیا یہی بتانے کے لیے آئے اور کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ہر لمحہ آدمی کو یہی سبق دے رہی ہے— یہی اسلامی توحید ہے۔

قرآن میں ہے: أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (14:10)۔ یعنی کیا تمھیں شک ہے اللہ کے بارے میں جس نے زمین وآسمان کو پھاڑا۔ قرآن کا یہ بیان بہ ظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً وہ سوال کا جواب ہے۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ وجودِ خداوندی کے حق میں ایک قطعی دلیل ہے، جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: (ترجمہ) کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ زمین وآسمان باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے (21:30)۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا موجودہ دائرہ (Radius) 2019 کی تحقیق کے مطابق 46.5 بلین نوری سال (46.5 billion light years) ہے، اور یہ کہ کائنات ایک حالت پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یکساں رفتار سے اپنے چاروں طرف مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں کسی وقت کائنات سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ فلکیات دانوں کے خیال کے مطابق، ابتدا میں پوری کائنات ایک بڑے ایٹم (super atom) کی صورت میں تھی۔ اس کے تمام اجزاء بے حد قوت کے ساتھ اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ تقریباً 13.8 بلین سال پہلے اس ابتدائی مادہ میں ایک دھماکہ یا اخراجِ طاقت (energy release) کا واقعہ ہوا، جس کے نتیجے میں سپر ایٹم کے اجزاء اپنے مرکز سے ٹوٹ کر اپنے چاروں طرف پھیلنے لگے تاکہ موجودہ کائنات کو وجود دے سکیں۔ سپر ایٹم کے اندر اس وقت جو اسباب کام کر رہے تھے، وہ تمام تر صرف اندر کی طرف کھنچنے اور سمٹنے کے تھے۔ اپنے ذاتی

قانون کے برخلاف اس کے اجزاء کا باہر کی طرف سفر شروع کرنا لازماً کسی خارجی طاقت کی مداخلت ہی سے ہوسکتا تھا۔ یہ واقعہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کائنات کے ماسوا ایک آزاد طاقت ورترین ہستی کا وجود تسلیم کریں، اور یہ کہ اس نے اپنے شعوری عمل سے ابتدائی مادہ کے اندر یہ غیر معمولی حرکت پیدا کی۔

قرآن میں ایک مقام پر کائنات کے نظم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: زمین وآسمان میں اگر ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو ضرور ان میں بگاڑ پیدا ہوجاتا (21:22)۔ قرآن کے یہ الفاظ اُس کائناتی واقعے کی طرف اشارہ کررہے ہیں، جو اِس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ مافوق طاقت صرف ایک ہے، کئی نہیں۔ تمام طبیعی علوم حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ پوری کائنات ایک ہی قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو قوانین زمین پر کام کررہے ہیں، وہی نہایت صحت کے ساتھ اجرامِ سماوی میں بھی کارفرما ہیں۔ یہی یقین تھا جس نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ کھربوں ڈالر خرچ کرکے خلائی مشینیں بنائے، اور ان کو چاند اور مریخ پر عین اپنے اندازے کے مطابق اتار سکے۔

اگر ساری کائنات ایک قانون کے تحت مکمل صحت کے ساتھ عمل نہ کررہی ہو تو زمین پر لگی ہوئی ہماری دوربینیں وسیع کائنات میں آٹھ ہزار ملین سالِ نور تک نہ ''دیکھ'' سکیں۔ ہمارے طبیعی علوم اچانک اپنی تمام اہمیت کھودیں۔ کائنات کا اس قدر درست طور پر وحدانی حالت میں ہونا بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک خدا کے کنٹرول میں ہے۔ اگر وہ کئی خداؤں کے کنٹرول میں ہوتی تو یقیناً اس میں انتشار برپا ہوجاتا۔ مختلف خداؤں کی کش مکش میں وہ درہم برہم ہوکر رہ جاتی۔ زمین پر ایک قانون کی حکمرانی ہوتی اور سیاروں پر دوسرے قانون کی۔ قرآن میں ایک مقام پر کائنات کے مینجمنٹ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: (ترجمہ) اللہ نے پیدا کی ہر چیز اور پھر ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر کردیا (25:2)۔ طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے، اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اگنورنس میں ڈاکٹر آئن رکسبرگ (پروفیسر تطبیقی ریاضیات کوئن میری کالج لندن) لکھتے ہیں: ''کائنات تعجب خیز حد تک یکساں (uniform) ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی

قوانین دریافت کیے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد (arbitrary numbers) پر مشتمل ہیں۔ جیسے الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ (mass) سے، جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلے میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر (arbitrarily) انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی تناسب ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں؟'' (سنڈے ٹائمس لندن 4 دسمبر 1977)

یہ واقعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ کائنات ہر آن ایک زبردست ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ جو خدا کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا حکمراں بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی — ''خدا اگر ہے تو ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔'' ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چیزوں کو دیکھے بغیر مانیں۔ یہ صرف خدا کے عقیدے کا سوال نہیں ہے۔ ہم جس کائنات میں ہیں اور جس کو ہم بہر حال مانتے ہیں، اس میں بے شمار چیزیں ہیں، جن کو ہم نہیں دیکھتے، اور نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کو ماننے پر مجبور ہیں۔ خدا کے سوا موجودہ کائنات کو بھی ہم ایمان بالغیب کا طریقہ اختیار کیے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر ایٹم میں کئی قسم کے ذرات (particles) تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نیوٹرینو (neutrino) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ذرے میں کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ حتی کہ اس میں کوئی مادہ (mass) بھی نہیں ہوتا۔ گویا وہ ایک لاشئے وجود ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں — نیوٹرینو لاشئے کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہے:

Neutrino is a tiny bundle of nothing.

اس لاشئے کا وجود کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم (atom) میں بعض ایسے خواص ظاہر ہوتے ہیں، جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں بنتی کہ ایٹم کے ڈھانچے میں ایک غیر ذرہ (non-particle) کا وجود تسلیم کیا جائے۔ اس مفروضہ نیوٹرینو کے عجیب وغریب اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی مادی جسم سے بغیر روک ٹوک گزر سکتا ہے۔ حتی کہ وہ اپنے سفر میں پورے کرۂ ارض کو اس کے اندر سے پار کر سکتا ہے۔ نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو انسانی استعمال میں

لانے کے لیے امریکا میں تجربات ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو قابل استعمال بنایا جاسکا تو پیغام رسانی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا— کائنات میں کسی چیز کو ''دیکھنا'' خالص علمی طور پر اس قدر ناممکن ہے کہ سائنسی فلاسفی کے درمیان خود اس امر میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ وہ کائنات کو ایک خارجی (objective) واقعہ قرار دیں یا محض ایک ذہنی یا داخلی (subjective) طور پر محسوس کی جانے والی چیز۔

خدا کو ماننا کبھی انسان کے لیے اتنا مشکل نہیں رہا ہے، جتنا خدا کا صحیح تصور قائم کرنا۔ تمام معلوم زمانوں سے انسان خدا کو مانتا رہا ہے، اور آج بھی کرۂ ارض کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے۔ مگر اصل کمی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود لوگ اس کے ساتھ ایسے عقیدے جمع کر لیتے ہیں، جس سے ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوجاتا ہے۔ کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی ایسی تعبیر کی کہ خدا کا کوئی علیحدہ اور مستقل وجود ہی مشتبہ ہوگیا۔ کسی نے خدا کو مانا مگر اسی کے ساتھ اس کے ایسے شرکا یا مقربینِ بارگاہ فرض کر لیے جس کے بعد خدا کی خدائی بے معنی ہو کر رہ گئی۔

خدا کے معاملے میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ ہمیشہ صرف ایک رہی ہے۔ کائنات کے معلوم واقعات پر خدا کو قیاس کرنا— انسان کے یہاں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں، اس لیے فرض کرلیا گیا کہ خدا کے لیے بھی بیٹے بیٹیاں ہوں گی۔ اور اس طرح ایک مقدس خدائی خاندان تیار ہوگیا۔ دنیا کے بادشاہوں کے یہاں کچھ مصاحبین اور درباری لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے فرض کرلیا گیا کہ خدا کے یہاں بھی کچھ مقرب ہیں، جن کو اس نے اختیار دے رکھا ہے، اور جن کی باتوں کو وہ سنتا ہے۔ دنیا میں بہت سی طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مثلاً سورج، ستارے، دریا وغیرہ۔ فرض کرلیا گیا کہ یہ سب خدائی میں شریک ہستیاں ہیں، اور بڑے خدا کے ساتھ مل کر خدائی کو چلا رہی ہیں۔ اس طرح خدا کا معاملہ ایک قسم کا ''مشترک کاروبار'' کا معاملہ بن گیا، وغیرہ۔

مظاہر پرستی کی یہی قسم تھی، جس نے فلسفیانہ ذہنوں میں پہنچ کر وحدت وجود کی صورت اختیار کی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کائنات ہے، جو انسان سے لے کر ستاروں تک بے شمار چیزوں سے

بھری ہوئی ہے۔ وہ اس تنوع میں وحدت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مطلق خدا ہے، جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کررہا ہے۔ اس طرح خدا کا تصور ایک ایسے مجرد خیال کی صورت میں ڈھل گیا، جس کی اپنی علیحدہ کوئی ہستی نہ ہو۔ ہر چیز اسی سے نکلتی ہو، اور ختم ہو کر دوبارہ اسی میں مل جاتی ہو۔ اسی تصور نے ''انسانی خداؤں'' کا عقیدہ پیدا کیا۔ یہ فرض کرلیا گیا کہ کچھ لوگ اپنی ریاضتوں سے اپنی دنیوی حیثیت کی اس طرح نفی کر لیتے ہیں کہ وہ جیتے جی خدا سے مل جاتے ہیں، اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں اس خدا کا جزء بن جاتے ہیں جس کا جزء دوسرے لوگ مرنے کے بعد، ان کے عقیدہ کے مطابق، بننے والے ہیں۔

اسلام نے خدا کے تصور سے اِن تمام مفروضہ قیاس آرائیوں کو جدا کیا۔ اس نے بتایا کہ اس طرح کا ہر اضافہ دراصل خدا کے عقیدے کی نفی ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہر لحاظ سے یکتائی کی صفت رکھتا ہے۔ جو اپنی ذات وصفات میں اشتراک کی تمام قسموں سے پوری طرح پاک ہو۔ قرآن میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: (ترجمہ) کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ اس کی اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہیں ہے اس کے برابر کوئی (112:1-4)۔

توحید کی عملی اہمیت

اسلام میں توحید کا عقیدہ ہیگل (Georg Wilhelm Friedrich Hegel [1770-1831]) کے فلسفے کی طرح محض ایک مجرد تصور (abstract idea) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی سے اس کا نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک وہی شخص موحد ہے، جو وحدتِ فکر کے ساتھ وحدتِ کردار کا بھی حامل بن جائے۔ اسلامی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق ایک ہے، اسی طرح اس کا مالک بھی ایک ہے۔ وہی ایک ہستی ہے، جس کے آگے انسان جواب دہ ہے، اور اپنے عمل کے مطابق، جس کے یہاں انسان سزا یا جزا پانے والا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ بھی، بالواسطہ طور پر، عقیدۂ توحید ہی کا ایک جزء بن جاتا ہے۔

خدا کے تخلیقی ظہور کو مانے بغیر جس طرح خدا کا عقیدہ بے معنی ہے، اسی طرح خدا کے محاسب

اور مجازی ہونے کی حیثیت کو جب تک تسلیم نہ کیا جائے، خدا کی یکتائی کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔ موجودہ کائنات اپنی اتھاہ حکمتوں کے ساتھ خدائے وحدہ لاشریک کی قدرت کاملہ کا ایک ظہور ہے۔ آخرت کا عالم اسی ظہورِ خداوندی کی تکمیل ہے۔ موجودہ دنیا وحدتِ الٰہی کا غیبی ظہور ہے، آخرت کی دنیا وحدتِ الٰہی کا مشاہداتی ظہور۔ موجودہ عالم میں توحید ایک غور وفکر کا موضوع نظر آتی ہے۔ آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی، جہاں توحید ایک ایسا قائم شدہ واقعہ بن جائے گا۔ اس دن توحید اسی طرح مسلمہ حقیقت ہوگی، جس طرح آج سورج ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مانے مگر خدا کی یکتائی کے اس ظہور کو تسلیم نہ کرے، جو آخرت کی صورت میں سامنے آنے والا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید ناقص ہے۔ وہ ایک فلسفی موحد ہوسکتا ہے، مگر اس کو اسلامی موحد کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔

''خدا ایک ہے'' یہ صرف ایک گنتی کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ تمام معلوم اور نا معلوم حقائق کی تشریح کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا ہو یا روحانی دنیا، حال کا معاملہ ہو یا مستقبل کا معاملہ، دنیا کے مسائل ہوں یا آخرت کے مسائل، تمام چیزیں اس وقت تک نا قابلِ فہم ہیں جب تک ان کو ایک فکری وحدت کی حیثیت نہ دے دی جائے، جب تک وحدتِ خداوندی کے ساتھ ان کی نسبت کو معلوم نہ کرلیا جائے۔ خدا کی یکتائی کی دریافت تمام حقائق کی مرکزی وحدت کی دریافت ہے۔ وہی توحید توحید ہے، جو ہمارے اوپر حقائق کی ابدی معنویت کو واضح کردے۔ جو نظریہ حقائق کی معنویت کو بحیثیت ایک کل کے واضح نہ کرے، وہ خواہ اور جو کچھ ہو مگر اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو توحید نہیں کہا جاسکتا۔

خدا کی وحدت کو پانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے، جب کہ وہ اسی کے ساتھ انسان اور کائنات کی وحدت کو پانے کے ہم معنی بن جائے۔ وہ ایک ایسے فکر کا درجہ حاصل کرلے جہاں تمام تضادات ختم ہوجائیں، اور صرف وحدت ہی آخری حقیقت کے طور پر باقی رہ جائے۔ ڈارون نے خالق (Creator) کا وجود تسلیم کیا ہے۔ مگر وہ یہ دریافت نہ کرسکا کہ خالق ہے تو اس کے اور انسان کے درمیان نسبت کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے نظریے کے بطن سے تاریخ کا سب سے زیادہ شدید الحاد برآمد ہوا۔ توحید کے عقیدے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ضروری ہے کہ توحید کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ وہ ہم کو توحید

اور انسان کے درمیان نسبت کی دریافت تک پہنچا سکے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ مطالعہ ادھورا رہے گا، بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ سچائی کے مسافر کو الٹی سمت میں کسی مقام پر پہنچانے والا بن جائے۔

توحید کا عقیدہ اور انسان

انسان کائنات کا صرف ایک حقیر حصہ ہے۔ کائنات جس طرح مکمل طور پر اپنے خالق اور مالک کے تابع ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کے لیے درست طرزِ عمل صرف یہ ہے کہ وہ اِس حقیقتِ واقعہ کو تسلیم کرے، اور خدا کی اطاعت کو قبول کرکے بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ خدا جس طرح ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اسی طرح انسان کے معاملات بھی اسی وقت سدھر سکتے ہیں، جب کہ وہ اپنے آپ کو خدائی کنٹرول میں دے چکا ہو۔ کائنات کی صحت کارکردگی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے۔

توحید تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے، اور ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ توحید دنیا میں قائم نہ ہو۔ توحید کیا ہے۔ اس حقیقتِ واقعہ کا تحقق کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کو سنبھالنے والا اور ہر قسم کی قوتوں کا واحد مالک صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو اس کائنات میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ذرے (atoms) سے لے کر کہکشانی نظاموں تک سارا عالم اس حقیقتِ توحید کی براہِ راست گرفت میں ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مالک الملک کے زیرِ انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ٹھیک ویسا ہی ہے، جیسا کہ فی الواقع اس کو ہونا چاہیے۔ اس کی کارگزاری میں آج تک کسی ادنیٰ نقص کا مشاہدہ نہ کیا جاسکا۔ وہ اتنی کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی اس کی رفتار میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ زمانے میں خدا کے وجود کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سب سے اہم وہ ہے جس کو نقص کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کائنات میں نقائص ہیں۔ ان نقائص کی موجودگی میں یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو کسی حکمت والے خدا نے بنایا ہے۔ اس

سلسلے میں ایک شخص نے یہ مثال دی ہے کہ زمین کی قوتِ کشش (force of Gravity) اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ اس کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ چند میٹر کی بلندی سے گرنے میں آدمی کا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر قوتِ کشش کم ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔

مگر اس قسم کی بات صرف کمتر غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے والا یہ بھول گیا کہ گرنا تو ایک حادثہ ہے، جو معمول کے خلاف کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن اگر زمین کی قوتِ کشش کم ہوتی تو اس پر معمول کی زندگی ہی درہم برہم ہوجاتی — انسان مضبوطی کے ساتھ زمین پر قائم نہ رہ سکتا، ہماری ریلیں پٹریوں پر نہ دوڑ سکتیں، ہمارے مکانات اور کارخانے اکھڑ جاتے، پانی زمین پر نہ ٹھیر سکتا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو بعض لوگوں نے نظام فطرت کا نقص سمجھا ہے، وہ نظامِ فطرت میں اعتدال وتوازن کا ثبوت ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ ناقابلِ چیلنج حد تک صحیح ہیں: (ترجمہ) اللہ نے بنائے سات آسمان اوپر تلے۔ تم اللہ کے اس بنانے میں کوئی فرق نہ دیکھو۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی خلل دکھائی دیتا ہے۔ بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمھاری نگاہ عاجز ہو کر اور تھکی ہوئی تمھاری طرف لوٹ آئے گی (67:3-4)۔

کائنات کا اس طرح بے عیب اور خالی از نقص ہونا اس لیے ہے کہ وہ براہِ راست خدا کے کنٹرول میں ہے۔ وہ خدا کی صفات کا مادی ظہور ہے۔ مگر انسانی دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اینٹن چیخوف (Anton Pavlovich Chekhov [1860-1904]) نے صحیح کہا ہے کہ ”یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔“ انسان ساری معلوم کائنات میں واحد مخلوق ہے، جو اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ عداوت کرتا ہے (سورہ البقرہ، 2:36)۔ وہ زمین پر اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے (سورہ الاعراف، 7:56)۔ وہ ایسی کارروائیاں کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کھیتیاں اور نسلیں برباد ہوں (سورہ البقرہ، 2:205)، وغیرہ۔

دو دنیاؤں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ کائنات براہِ راست اللہ کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ وہ ویسی ہی رہنے کے لیے مجبور ہے جیسی کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ کی طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادے کے تحت صحیح یا غلط راستے پر چلنے کا

اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کی مرضی کی پابند ہے، اس لیے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس، انسان اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے۔ اس لیے اس کے سارے معاملات میں فساد اور بگاڑ برپا رہتا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے، وہ انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشے کو ساری تاریخ میں درست ثابت کیا ہے، جو انھوں نے اس کی پیدائش کے وقت خدا کے سامنے ظاہر کیا تھا: ''کیا تو ایسے لوگوں کو زمین میں اختیار دے رہا ہے جو وہاں فساد کرے اور خون بہائے (سورہ البقرہ، 2:30)۔

یہ آزادی جو انسان کو حاصل ہے، یہ مطلق آزادی نہیں۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے، اور خاص منصوبے کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے (سورہ الملک، 67:2)۔ کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے، جو آزادی پا کر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے (سورہ الانفال، 8:37)۔ دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے، جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہوجاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام بھی براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا، جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے (سورہ مریم، 19:40)۔ اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کردیے جائیں گے (سورہ آل عمران، 3:197)۔ اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی، اور برے لوگ ابدی طور پر کائناتی کوڑا خانے میں ڈھکیل دیے جائیں گے۔

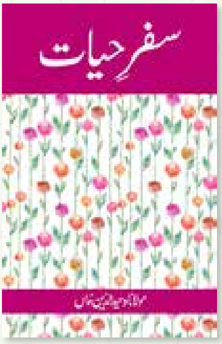
دوسرے لفظوں میں یہ کہ موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے شہری چنے جارہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے، جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے، وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ اللہ کی دنیا کے شہری بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفے میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ابدی دنیا کے وارث قرار پائیں گے (سورہ الانبیاء، 21:105)، اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کرکے دور پھینک دیا جائے گا۔

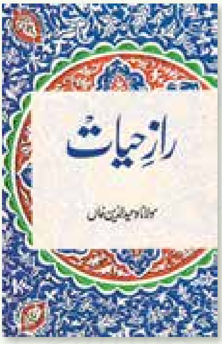
لیوس ٹامس (Lewis Thomas) ایک امریکی سائنس داں اور فلسفی ہے۔اس کی پیدائش 1913 میں ہوئی، اور وفات 1993 میں ہوئی۔ بائیولوجی پر اس کی ایک کتاب ہے۔اس کتاب میں اس نے زمین کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں— وہ خلا میں لٹکا ہوا، اور بظاہر ایک زندہ کرہ ہے:

> hanging there in space and obviously alive. (Lewis Thomas, The Fragile Species, Collier, 1993, p. 135)

یہ زمین (planet earth) کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ زمین ایک اتھاہ خلا (vast space) میں مسلسل گردش کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ زمین کے جو احوال ہیں، وہ انتہائی استثنائی طور پر ایک زندہ کرہ کے احوال ہیں۔ یہ چیزیں اتنی حیرت ناک ہیں کہ اگر ان کو سوچا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور بدن میں کپکپی طاری ہو جائے۔ زمین میں اور بقیہ کائنات میں اتنی زیادہ نشانیاں ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان میں سنجیدگی سے (sincerely) غور کرے تو یہ کائنات اس کے لیے خدا کی معرفت اور جلال و جمال کا آئینہ بن جائے۔







CPS International
centre for peace & spirituality
cpsglobal.org

Goodword
goodwordbooks.com

ISBN 978-93-89766-09-7
9 789389 766097
₹90.00
Khuda Ki Daryaft